اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

حبیب جالب: شخصیت اور فن

سعید پرویز

پاکستانی ادب کے معمار

حبیب جالب
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

حبیب جالب
شخصیت اور فن

سعید پرویز

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ : فخر زمان
منتظم : خالد اقبال یاسر
تدوین و طباعت : سعیدہ درانی
اشاعت اول : 2009
اشاعت دوئم : 2010
تعداد : 500
ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع : ماریہ پرنٹرز اسلام آباد
قیمت : مجلد: -/280 روپے
غیر مجلد: -/270 روپے

ISBN: 978-969-472-259-7

Pakistani Adab Kay Maimar

Habib Jalib : Shakhsiyat-aur-Fun

Compiled By

Saeed Pervaiz

Publisher

Pakistan Academy of Letters

Islamabad,Pakistan

فہرست

پیش نامہ

پاکستانی زبانوں میں ہمارے مشاہیر نے پاکستانی ادب کے حوالے سے جو کام کیا ہے کسی بھی بین الاقوامی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان مشاہیر کے علمی وادبی کام اور اُن کی حیات کے بارے میں معلومات کو کتابی صورت میں لانے کے لیے پاکستانی ادب کے معمار کے نام سے اشاعتی منصوبہ شروع کیا ہے۔جس کے تحت پاکستانی زبانوں کے مشاہیر پر کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔

اسی اشاعتی منصوبے کی ایک کتاب ''حبیب جالب: شخصیت اور فن'' اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر ملک کے معروف ادیب محترم سعید پرویز صاحب نے تالیف کی ہے۔ اس کتاب سے یقیناً اہل ادب اور عام قاری حبیب جالب کی فن وشخصیت سے بہتر طور پر آگاہ ہوسکیں گے۔

حبیب جالب بیباک اور مزاحمتی لہجہ رکھنے والے شاعر تھے۔ ان کے لفظوں میں ایسی قوت تھی کہ آمریت مسخ ہونے لگتی تھی۔ عوامی شاعر کی حیثیت سے جب ان کی شہرت پھیلی تو ستم زدوں، مظلوموں، محنت کشوں اور مزدوروں کا ایک قافلہ ان کے ہم رکاب ہوگیا۔ حبیب جالب عوامی مسائل پر عوامی لہجے میں شعر کہتے تھے جو مقبول عام تھے۔

حبیب جالب نے اپنی نظریاتی وابستگی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا ان کے سامنے بارہا سنہری مواقع رکھے گئے وہ چاہتے تو اپنے اور اپنے خاندان کے لیے خاموشی سے مصلحت اندیشی اختیار کر لیتے اور ایک خوشحال زندگی بسر کرنے پر سمجھوتہ کر لیتے لیکن دُنیا میں ایسا

کوئی ترازو نہیں بنا تھا جو اس باضمیر شاعر کو تول سکتا وہ ان خاص لوگوں میں سے تھے جو جمہوری اقدار کے لیے جیتے اور مرتے تھے۔

آمریت کے خلاف ان کا موقف ہمیشہ جتنا واضع اور سچا رہا اور شاعری میں بھی ان کا لہجہ عوام کے جذبات سے گہری وابستگی کا غماز رہا اور ان کی فکر و نظریے کی قوت نے انہیں جو یکتائی دی وہی ہم عصر شعراء میں انہیں ممتاز کرتی ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان کی یہ کتاب حبیب جالب کے بارے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت کی حامل ہوگی۔ امید ہے کہ اکادمی ادبیات کے اشاعتی منصوبے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کی کتاب ''حبیب جالب: شخصیت اور فن'' کو ملک اور بیرون ملک یقیناً پسند کیا جائے گا۔

فخر زمان

پیش لفظ

حبیب جالب جیسے لوگ اللہ کے خاص بندے ہوا کرتے ہیں اور اللہ کی مرضی وہ اپنے خاص بندوں کو جہاں چاہے جس خاندان میں چاہے پیدا فرمادے۔ حبیب جالب کی اپنے خاندان میں پیدائش پر ہم اللہ کے شکر گزار ہی ہو سکتے ہیں اور ہیں۔

بے نیازی اللہ کی صفت ہے اور اللہ نے اپنی اس صفت سے اپنے ''خاص بندے'' حبیب جالب کا خمیر تیار کیا تھا اور دنیا نے دیکھا کہ جالب نے تمام زندگی بے نیازی سے گزاری۔ خوف سے بے نیاز، لالچ سے بے نیاز ہر حکومت نے جالب کے سامنے ''بلینک چیک'' رکھا مگر انہوں نے شانِ بے نیازی سے ہر بار ایسی پیشکشوں کو ٹھوکروں میں اڑا دیا۔ حتیٰ کہ انتقال سے سال چھ ماہ پہلے عراق، ایران اور لیبیا نے ''خدمت'' کی پیشکش کی۔ مگر شکریہ کے ساتھ اسے بھی قبول نہ کیا۔ اور خود پر ناز کرتے ہوئے جالب کہتے ہیں۔

ہر اہلِ جور کی خواہش رہی ہے، میں نہ رہوں
مگر میں ہوں کہ مرا شعلۂ نوا نہ بجھا

ایسے صاحبِ کمال کا حقیقی بھائی ہونا، اپنی جگہ، مگر میرا حبیب جالب سے مضبوط رشتہ نظریاتی ساتھی کا ہے اور اس مضبوط رشتے کی وجہ سے میں اب تک حبیب جالب (اپنے ہیرو) پر چھ کتابیں تحریر اور مرتب کر چکا ہوں۔ دنیا اور دنیا کے جھوٹے خداؤں کو ماننے سے انکاری جالب کہا کرتے تھے ''اتنا لوگوں نے حاصل نہیں کیا جتنا میں نے ٹھکرایا۔'' حبیب جالب کو رخصت ہوئے 15 سال ہو چکے، اور میں دیکھ رہا ہوں کہ لوگ حبیب جالب کو نہیں بھولے، بلکہ ہر گزرتا دن جالب کے فکر و نظر میں اضافہ کر رہا ہے۔ نئی نسل کے جوان جالب کے نغمے گا رہے ہیں ان کی

نظموں پر مصوری کر رہے ہیں۔ یقیناً اپنے کام کی وجہ سے جالب کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

زیر نظر کتاب بھی میں نے اپنے ہیرو (جالب) کی عقیدت و محبت کی دھن میں تحریر کر لی۔ اور میں اپنی کاوش کو اپنی نانی جان ''نانی گوماں'' (غلام فاطمہ) کے نام کر رہا ہوں کہ وہ عظیم ہستی اپنے نواسے حبیب جالب کی عاشق تھیں اور جالب کی پہلی کاروباری شراکت دار واقعہ یہ ہے کہ جب نابینا نانی گوماں اپنے دس سالہ نواسے حبیب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ازار بند، پراندے، جرابیں بیچنے کے لیے گلیوں گلیوں، گاؤں گاؤں گھوما کرتی تھیں۔

جالب کے اس شعر پر اجازت ہے

ہمارے ذکر سے خالی نہ ہوگی بزم کوئی
ہم اپنے ذہن کی، وہ باس چھوڑ آئے ہیں

سعید پرویز

سوانحی خاکہ

نام

حبیب احمد

والد کا نام

صوفی عنایت اللہ خان

والدہ کا نام

محترمہ رابعہ بصری

بہن بھائی

مشتاق حسین مبارک، رشیدہ بیگم، عبدالحمید خان، سعید پرویز

بیوی کا نام

ممتاز بیگم

بچوں کے نام

۱۔ ناصر عباس، ۲۔ انور ہدیٰ، ۳۔ نور افشاں، ۴۔ لیلیٰ خالد، ۵۔ طاہرہ، ۶۔ یاسر عباس، ۷۔ رخشندہ زویا، ۸۔ حجاب فاطمہ

شعری مجموعے

۱۔ برگِ آوارہ، ۲۔ سرِ مقتل، ۳۔ عہدِ ستم، ۴۔ ذکر بہتے خون کا، ۵۔ گوشے میں قفس کے، ۶۔ عہدِ سزا، ۷۔ حرفِ حق، ۸۔ اس شہرِ خرابی میں، ۹۔ جالب نامہ، ۱۰۔ حرفِ سردار، ۱۱۔ کلیات حبیب جالب، ۱۲۔ رقصِ زنجیر (فلمی گیت)

حبیب جالب سے متعلق دیگر کتابیں

۱۔ حبیب جالب ۔۔ ''فن اور شخصیت'' (پچاسویں سالگرہ کے موقع پر 1978 میں لاہور کے ادبا نے شائع کی)

۲۔ کوئی تو پرچم لے کر نکلے (مرتب: مجاہد بریلوی)

۳۔ بیادِ جالب (مرتب: مجاہد بریلوی)

۴۔ حبیب جالب ۔۔۔ ''فن اور شخصیت'' (مرتب مجاہد بریلوی)

۵۔ جالب بیتی (مرتب: طاہر اصغر، طبع، جنگ پبلی کیشنز)

۶۔ بیسویں صدی کا عوامی شاعر ۔۔۔ حبیب جالب (مرتب: ظہور احمد خان، رانا عبدالرحمان)

۷۔ جالب جالب (تحریر۔ جمال احسانی، طابع: معراج رسول، کراچی)

۸۔ جالب، انصاف کا طالب (مرتب: ضیا ساجد)

۹۔ حبیب جالب ۔۔ ''گھر کی گواہی'' (تحریر و ترتیب: سعید پرویز)

۱۰۔ حبیب جالب ۔۔ ''شاعرِ شعلہ نوا'' (تحقیق و تدوین۔ سعید پرویز)

۱۱۔ چاروں جانب سناٹا ہے (منتخب کلام، مرتب: طاہر اصغر)

۱۲۔ رقصِ زنجیر (فلمی نغمات، مرتب: طاہر اصغر)

۱۳۔ جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے (شاعر حبیب جالب: انتخاب سعید پرویز)

۱۴۔ رات کلہینی (پنجابی شاعری، حبیب جالب، انتخاب: سعید پرویز)

۱۵۔ حبیب جالب ''میں طلوع ہو رہا ہوں'' (تحریر، تحقیق، تدوین: سعید پرویز)

وہ جو ابھی اس راہ گزر سے چاک گریباں گزرا تھا
اس آوارہ دیوانے کو جالب جالب کہتے ہیں

حبیب جالب

(24 مارچ 1928 سے 13 مارچ 1993 تک)

پیدائش: 1928

24 مارچ 1928 مطابق یکم شوال (عیدالفطر) 1346 ہجری بروز ہفتہ صبح سوا آٹھ بجے گاؤں میانی افغاناں ضلع ہوشیار پور مشرقی پنجاب (انڈیا)

پرائمری و دینی تعلیم: 1935-1940

گاؤں میانی افغاناں ضلع ہوشیار پور (انڈیا) پرائمری اسکول، مولانا غلام رسول عالم پوری (مصنف یوسف زلیخا) کے شاگرد عیسٰی مہر سے قرآن شریف پڑھا۔

ہائی اسکول: 1941-1947

گاؤں میانی افغاناں ضلع ہوشیار پور (انڈیا) ہائی اسکول سے جماعت پنجم پاس کی اور دہلی کے اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوئے۔

پہلا شعر: 1942

جماعت ہفتم کے امتحانی پرچے میں ''وقتِ سحر'' کا جملہ بنانے کو کہا گیا تھا اور جملے کی جگہ شعر ہو گیا۔

وعدہ کیا تھا آئیں کے امشب ضرور وہ
وعدہ شکن کو دیکھتے وقتِ سحر ہوا

دوسرا شعر: 1945

اسکول کے سامنے مسجد تھی جہاں اساتذہ اور طلباء باجماعت نماز ادا کیا کرتے تھے بعد نماز دعا ہوتی تھی۔ اس طرح یہ شعر اہوا۔

مدتیں ہوگئیں خطا کرتے
شرم آتی ہے اب دعا کرتے

عملی زندگی کا آغاز: 1945

دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا جالب صاحب اسکول کے بعد فوجی بارکوں میں چلے جاتے جہاں بچے چنے تھیلوں میں بھرتے۔ سو تھیلیاں بھرنے کی مزدوری بارہ آنے ملتی تھی۔ یوں گھر کی کفالت میں حصہ دار بنے۔

حضرت سائل و بیخود: 1945-1946

دہلی میں حضرت سائل حضرت بیخود کو مشاعروں میں سنا کہ جنہوں نے غالب و داغ کو سن رکھا تھا ان کے علاوہ جرأت اور جگر صاحب کو بھی سنا۔

تحریک پاکستان: 1945-1946

دہلی کے علاقے تیمار پور میں (جہاں جالب صاحب رہتے تھے) ہونے والے مسلم لیگی جلسوں اور اجتماعات میں مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال کا کلام پڑھا کرتے تھے علاوہ ازیں دہلی شہر کے نوجوانوں پر مشتمل مسلم لیگی تحریک میں باقاعدہ شامل تھے۔

پاکستان آمد: 1947

14 راگست 1947 بڑے بھائی مشتاق مبارک کے ہمراہ کراچی آمد۔

محنت مزدوری: 1948-1947

کراچی کی بندرگاہ پر مزدوری کی۔

مشاعروں میں باقاعدہ شرکت: 1948

حبیب احمد اور تخلص مست یعنی حبیب احمد مست میانوی کے نام سے کراچی کے مشاعروں میں شرکت۔

داخلہ ھائی اسکول: 1949

حالات کی وجہ سے منقطع تعلیمی سلسلے کا دوبارہ آغاز گورنمنٹ بوائز سکینڈری اسکول جیکب لائن کراچی درجہ دہم میں داخلہ لیا جہاں نصر اللہ خان (سینئر کالم نگار) اور اے۔ ٹی۔ چوہدری (ڈان) استاد تھے جمیل نشتر (سردار عبدالرب نشتر کے صاحبزادے) بھی اسی اسکول میں پڑھتے تھے۔

ملازمت روزنامہ "جنگ" و "ڈان" کراچی:

بطور پروف ریڈر روزنامہ "جنگ" روزنامہ "ڈان" ملازمت **(چند ماہ)**

ھاری تحریک: 1952

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی ہاری تحریک میں شمولیت۔

کوہ نور ٹیکسٹائل ملز لائل پور میں ملازمت اور برطرفی:1952

لائل پور (فیصل آباد) میں مشاعرہ پڑھا سامعین میں بیٹھے ہوئے سعید سہگل (مالک کوہ نور

یکسٹائل ملز) نے خوش ہو کر مل میں ملازمت دے دی اور رہنے کو کمرہ، کچھ ہی دن بعد مل میں مشاعرہ ہوا جس میں جالب صاحب نے یہ شعر پڑھے

شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی مشینوں میں
پیار کی روشنی نہیں ملتی
ان مکانوں میں اِن مکینوں میں

اور اس کے بعد انہیں کوہ نور ٹیکسٹائل ملز سے نکال دیا گیا۔

جگر صاحب کے ساتھ مشاعرہ: 1952

پنجاب یونیورسٹی ہال لاہور میں زیر صدارت حضرت جگر مراد آبادی مشاعرے میں، جگر صاحب نے پہلی بار جالب صاحب کو سنا اور ان کی غزل کے ایک ایک شعر پر بے پناہ داد دی اور پھر کہا کہ "اگر ہمارا زمانہ۔ مئے نوشی ہوتا تو ہم جالب کی غزل پر سرِ محفل رقص کرتے۔

اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ: 1953

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے توسط سے اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا ساتھ ساتھ روزنامہ "آفاق" میں پچھتر روپے ماہوار پر بطور پروف ریڈر ملازمت۔

پہلی گرفتاری: 1954

"ہاری تحریک" کے کارکن کی حیثیت سے کراچی میں گرفتار ہوئے

ہندوستان کے مشاعرے: 1961-1954

ہندوستان کے مشاعروں میں شرکت، دہلی، بمبئی، حیدرآباد دکن، لکھنو، ناگپور، گوالیار وغیرہ

پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں مشاعرہ: 1956

ہندوستان مشاعرے میں گئے تھے پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندوستان کی خواہش پر پاکستانی شعرا پرائم منسٹر ہاؤس مدعو کیے گئے جالب صاحب کے علاوہ شوکت تھانوی اور حفیظ جالندھری بھی تھے جالب نے فرمائش پر اپنی غزل سنائی۔

محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
ترے شہر میں اِک جہاں چھوڑ آئے

وہاں ایک پینٹنگ لگی ہوئی تھی جو ہجرت سے متعلق تھی مہاجرین آ جا رہے تھے جالب صاحب کی غزل اس پینٹنگ کا اظہار تھی جسے پنڈت جی نے بھی پسند کیا۔

اپنے گاؤں گئے: 1956

جالب صاحب ہندوستان مشاعرے سے واپس پاکستان آ رہے تھے ٹرین جالندھر رکی تو سامنے ہی بس والے آواز لگا رہے تھے ''ٹانڈے۔ٹانڈے'' جالب صاحب سے نہ رہا گیا اور وہ ٹانڈے جانے والی بس میں سوار ہو گئے ٹانڈہ پہنچے تو وہاں سے ساڑھے تین میل کی مسافت پر گاؤں میانی افغاناں تھا لہٰذا ٹانڈے سے سائیکل رکشہ میں بیٹھے جسے کوئی سردار جی چلا رہے تھے اور اپنے گاؤں میانی افغاناں پہنچ گئے جہاں ایک آدھ گھنٹے قیام کے بعد ان کے میزبان مولک رام نے انہیں رخصت کر دیا۔حالات اس وقت بھی کشیدہ تھے۔

پہلا فلمی گیت: 1956

''مس 56'' نامی فلم (جس کے ڈائریکٹر روپ کے شوری اور موسیقار جی۔اے۔چشتی تھے) کے لیے پہلا فلمی گیت لکھا۔جسے مہدی حسن اور نذیر بیگم نے گایا تھا گیت کے بول تھے۔

یہ چاندنی یہ سائے
پہلو میں تم ہو میرے
پھر کیوں نہ پیار آئے

شادی: 1956

محرم کی 6 تاریخ اور 1956 ملتان میں چچا کی بیٹی سے شادی ہوئی۔

NAPمیں شمولیت: 1956

نیشنل عوامی پارٹی میں شمولیت اور تا حیات اسی ایک ہی سیاسی جماعت سے وابستہ رہے، علاوہ ازیں ہم خیال سیاسی تنظیموں اور پارٹیوں کے ساتھ تعاون بھی رہا۔

برگِ آوارہ 1957

پہلی کتاب ''برگِ آوارہ'' مکتبہ کارواں لاہور نے شائع کی۔ ناشر چودھری عبدالحمید

لاہور منتقلی: 1958

کراچی سے والدین، بیوی، بہن اور چھوٹے بھائی کے ساتھ لاہور مستقل قیام کے لیے آمد۔

مومن کا کردار: 1959

پاکستانی فلم ''غالب'' میں شاعر مومن خان مومن کا کردار ادا کیا۔

میں نہیں مانتا: 1962

فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خان کے بنائے گئے دستور کے خلاف پہلی آواز۔

ایسے دستور کو، صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

ملک سے باہر جانے پر پابندی: 1962

جنرل ایوب خان کی حکومت نے بیرون ملک جانے پر پابندی عائد کردی۔

محترمہ فاطمہ جناح بمقابلہ ایوب خان: 1964

مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح نے جنرل ایوب خان کے مدِ مقابل انتخاب میں حصہ لیا، محترمہ فاطمہ جناح کی جانب سے ملک کی پانچ شخصیات کو انتخابی مہم کے دوران ساتھ ساتھ رہنا تھا، ان میں ایک حبیب جالب بھی تھے۔

اقدام قتل کے تحت گرفتار: 1964

محترمہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم سے دور رکھنے کے لیے لاہور کے ایک ہسٹری شیٹر وارث پر قاتلانہ حملہ کے الزام میں حبیب جالب گرفتار اور سیشن جج کی عدالت سے سات سال قید بامشقت کی سزا بعد ازاں لاہور ہائی کورٹ سے باعزت رہائی۔ جالب صاحب کی جانب سے میاں محمود علی قصوری بطور وکیل پیش ہوئے جبکہ نمایاں گواہ عبداللہ ملک (ممتاز صحافی، دانشور) تھے۔

سرِمقتل: 1966

دوسری کتاب ’’سرِ مقتل‘‘ مکتبہ کارواں لاہور نے شائع کی اور ایک ماہ میں کتاب کے چار ایڈیشن شائع ہوئے جو ایک ریکارڈ ہے ستمبر 66 سے نومبر 66 تک سرِ مقتل کے سات ایڈیشن شائع ہوئے پھر کتاب حکومت نے ضبط کر لی۔

یوم حمید نظامی: 1967

وائی۔ایم۔سی۔اے ہال لاہور میں حمید نظامی صاحب کی برسی پر جلسہ ہوا۔ صدارت ذوالفقار علی بھٹو کر رہے تھے اور اسٹیج سیکرٹری شورش کاشمیری تھے جلسہ میں ’’چھ ستمبر‘‘ نامی نظم پڑھنے پر حبیب جالب گرفتار کر لیے گئے۔

جنگ جاری رہی: 1969

جنرل ایوب خان جاتے ہوئے اقتدار جنرل یحیٰی خان کو سونپ گئے جالب صاحب کی جنگ جاری تھی ''مری'' کے مشاعرے میں جالب صاحب نے نئے حکمران کی تصویر لگی دیکھ کر کہا

تم سے پہلے وہ جو اِک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

انتخابات: 1970

انتخابات 1970 میں پنجاب اسمبلی کی رکنیت کے لیے جالب صاحب نے نیشنل عوامی پارٹی کے ٹکٹ پر حصہ لیا جالب صاحب کو ساڑھے سات سو ووٹ ملے نتیجہ پر تبصرہ کرتے ہوئے سید محمد تقی (ایڈیٹر روزنامہ جنگ) نے ٹیلی ویژن پر کہا کہ حبیب جالب کا ہارنا نہایت افسوسناک ہے۔

منزل کھو رہے ہو: 1971

کسان ہال لاہور میں جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے جالب صاحب نے کہا ''یحیٰی خان اور نورالامین اپنے ساتھیوں سمیت ملک توڑ رہے ہیں پولیس والو میرا بیان لکھ لو کہ آج کے بعد چپ رہنا بددیانتی اور جیل سے باہر رہنا بے غیرتی ہے'' پھر یہ قطعہ پڑھا اور گرفتار ہو کر کیمپ جیل لاہور چلے گئے۔

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

گرفتاری: 1973

ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں حزبِ اختلاف کی جماعتوں کی جانب سے تحریکِ سول

نافرمانی کے تحت پروگرام کے مطابق پہلے گروپ نے گرفتاری پیش کی۔ جالب صاحب کے ساتھ نوابزادہ نصر اللہ خان، ملک محمد قاسم اور مذہبی جماعتوں کے تین نمائندے شامل تھے گرفتاری نوابزادہ صاحب کے دفتر نکلسن روڈ لاہور سے پیش کی گئی۔

حیدر آباد سازش کیس: 1976

جالب صاحب کے بارہ سالہ بیٹے طاہر عباس مرحوم کا سوئم تھا کہ جب ایف۔ ایس۔ ایف اور پولیس نے گھر کے گرد گھیرا ڈال لیا اور بغاوت کے مقدمہ کے تحت گرفتار کیا نیشنل عوامی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ارکان سمیت 55 افراد گرفتار ہوئے۔

ضمانت پر رہائی: 1978

لاہور کے لطیف بٹ کی وساطت سے رانا نذر الرحمان اور رانا ظفر اللہ خان نے دو دو لاکھ روپے کی ضمانت پیش کی اور جالب صاحب چودہ ماہ بعد حیدر آباد جیل سے رہا ہوئے۔

گولڈن جوبلی: 1978

حبیب جالب کی پچاسویں سالگرہ (1928 سے 1978) ملک کے بڑے شہروں کے علاوہ قصبوں اور دیہاتوں میں بھی منائی گئی، دوسرے ممالک میں بھی تقریبات ہوئیں۔ خصوصاً لومبا یونیورسٹی، روس، میں پچاسویں سالگرہ کی تقریب ہوئی اور بطور یادگار جالب صاحب کے لیے کارل مارکس اور لینن کے مجسمے (خاص دھات کے) بھیجے گئے۔ اس موقع پر لاہور کے اہل قلم نے ''حبیب جالب۔۔۔فن اور شخصیت'' کے عنوان سے ایک کتاب بھی شائع کی جس کے ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز تھے۔ کتاب کا رنگین ٹائٹل 'صادقین' نے خود خواہش ظاہر کر کے بنایا اور جالب صاحب کے ایک قطعے کی خطاطی بھی کی۔ کتاب میں سبط حسن، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، انتظار حسین، فارغ

بخاری، عبداللہ ملک، محمد خالد اختر، محسن احسان، سلیم اختر و دیگر کی تحریریں شامل تھیں۔

پریس کلب کراچی تاحیات رکنیت: 1980

25 دسمبر 1980 جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں اکادمی ادبیات کا پہلا اجلاس اسلام آباد میں منعقد ہوا جس میں ملک بھر کے ادیب، شاعر، دانشور شریک ہوئے عین اسی دن کراچی پریس کلب نے حبیب جالب کو اپنے کلب کی تاحیات رکنیت دی اور جالب صاحب نے پہلی بار اپنی نظم پریس کلب کے عظیم الشان جلسہ میں پڑھی اسٹیج پر سید سبط حسن بیٹھے تھے۔

ظلمت کو ضیاء صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو گہر دیوار کو در کرگس کو ہما کیا لکھنا

لاہور ھائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی اعزازی رکنیت: 1982

لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے ایک متفقہ قرار داد کے ذریعے حبیب جالب کو بار کی اعزازی رکنیت سے نوازا۔ اس وقت تک جالب صاحب بار کے واحد غیر وکیل رکن تھے۔

پٹے سڑک کے بیچ: 1983

خواتین نے آدھی گواہی کے خلاف لاہور میں احتجاجی جلوس نکالا، جہاں پولیس نے خواتین کے ساتھ جالب صاحب کو بھی سرِ عام گھونسوں، لاتوں اور بندوق کے بٹوں سے مارا جس پر جالب صاحب نے کہا تھا۔

جسم پہ جو زخموں کے نشاں ہیں اپنے تمغے ہیں
ملی ہے ایسی داد وفا کی کسے سڑک کے بیچ

جوا کھیلتے ہوئے گرفتاری: 1984

مرزا غالب کی طرح، حبیب جالب بھی جوا کھیلنے کے الزام میں گرفتار ہوئے۔

یوں بھی گرفتاری: 1985

جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں ہی ایک بار حبیب جالب کو دسویں محرم سے پہلے یہ کہہ کر گرفتار کیا گیا کہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ نے دس محرم کے جلوس پر پتھراؤ کرنا ہے اسی طرح قسور گردیزی بھی گرفتار ہوئے جبکہ ان کا تعلق فقہ جعفریہ سے تھا۔

حرفِ سر دار 1987

اردو مرکز لندن کے تحت تھرڈ ورلڈ آرگنائزیشن کے ہمایوں گوہر نے ''حرف سردار'' کے نام سے جالب صاحب کے تمام کلام کو شائع کیا اس اہتمام سے صرف دو شعراء کا کلام شائع ہوا دوسرے شاعر حضرت فیض احمد فیض تھے۔

پاسپورٹ بحال: 1988

پیپلز پارٹی گورنمنٹ (محترمہ بے نظیر بھٹو) میں وزیر داخلہ چوہدری اعتزاز احسن نے حبیب جالب کا پاسپورٹ بحال کیا۔

دورہ ماسکو: 1989

فارسی کے عظیم شاعر مولانا نورالدین جامی کی پانچ سو پچھترویں سالگرہ کے موقع پر جالب صاحب پاکستان سے شرکت کے لیے روانہ ہوئے جہاں اکادمی آف سائنسز میں جالب صاحب نے مولانا جامی کے لیے نظم پڑھی جس کا روسی زبان میں ترجمہ معروف ادیبہ نومیلا نے پیش کیا۔

مسلسل بیماری: 1991

مارچ 1991 میں جالب صاحب کی بڑی بیٹی نور افشاں کی شادی ہوئی اس کے بعد جالب صاحب اکثر و بیشتر لاہور و کراچی کے ہسپتالوں میں داخل رہے۔

سروسز ہسپتال: 1992

اگست 1992 میں مرحوم نثار عثمانی اور حبیب جالب سروسز ہسپتال لاہور کے ایک بڑے کمرے میں آمنے سامنے پڑے تھے۔

عراق، ایران ،لیبیا: 1992

لیبیا نے مالی تعاون کی پیشکش کی جسے جالب صاحب نے مذکورہ حکومتوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے قبول نہیں کیا۔

زید ہسپتال لاہور سے لندن روانگی: 1992

روزنامہ جنگ کے خرچ پر حبیب جالب بغرض علاج کرامویل ہسپتال لندن روانہ ہوئے جہاں تقریباً ایک ماہ رہنے کے بعد واپس زید ہسپتال لاہور آ گئے بے حد کمزوری علاج کی راہ میں حائل ہوئی۔

سوگئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے: 1993

12 اور 13 مارچ کی درمیانی رات ساڑھے بارہ بجے شیخ زید ہسپتال لاہور میں شاعر عوام حبیب جالب 65 برس کی عمر میں وفات پا گئے۔

اب رہیں چین سے بیدرد زمانے والے
سوگئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

اعزازات

شاعرِ عوام

عوام نے حبیب جالب کو شاعرِ عوام کا خطاب دیا، اور فیض سمیت ادب کے تمام اکابرین نے عوام کے اس فیصلے کی تائید کی۔

گریجویٹ ایوارڈ 1966

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوق آوارگی

بہترین نغمہ نگار کا ایوارڈ دیا گیا۔ اس گیت کو گلوکار احمد رشدی نے گایا اور موسیقار مصلح الدین تھے اور فلم تھی ''جوکر''۔

نگار ایوارڈ :1969

فلم ''زرقا'' پاکستان فلم انڈسٹری کی پہلی ڈائمنڈ جوبلی (100 ہفتے) فلم تھی اس فلم کا تھیم سانگ ۔

تو کہ ناواقفِ آدابِ غلامی ہے ابھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

یہ گیت گلوکار مہدی حسن نے گایا تھا جبکہ لفظ ''اللہ'' کی ادائیگی اداکارہ رضیہ کا کمال تھا۔ موسیقار رشید عطرے تھے۔

انجمن تحفظ حقوق انسانی: 1980

انجمن تحفظ حقوق انسانی (پاکستان) کی جانب سے جالب صاحب کو سلور میڈل دیا گیا۔
حبیب جالب جیل میں تھے۔لہٰذا میڈل ان کے بڑے صاحبزادے ناصر عباس نے وصول کیا۔

انجمن تحفظ حقوق انسانی: 1986

انجمن تحفظ حقوق انسانی (پاکستان) کی جانب سے حبیب جالب صاحب کو گولڈ میڈل دیا گیا
جسے انہوں نے خود وصول کیا۔

نگار ایوارڈ: 1986

فلم ''چوروں کی بارات'' کے تمام گیت حبیب جالب نے لکھے اس فلم کے تھیم سانگ پر انہیں
ایک مرتبہ پھر بہترین نغمہ نگار کا ایوارڈ دیا گیا۔

گریجویٹ ایوارڈ: 1986

بہترین نغمہ نگار فلم ''چوروں کی بارات''

نگار ایوارڈ: 1987

فلم ''ہم ایک ہیں'' کے تمام گیت حبیب جالب نے لکھے۔اس فلم کے موسیقار نثار بزمی تھے فلم
کے تھیم سانگ ''ہم ایک ہیں'' پر جالب صاحب کو بہترین نغمہ نگار کا ایوارڈ دیا گیا۔

حسرت موہانی ایوارڈ: 1988

عالمی اردو کانفرنس منعقدہ دہلی (انڈیا) میں حبیب جالب صاحب کو حسرت موہانی ایوارڈ دیا گیا۔

جمہوریت ایوارڈ :1989

نیشنل بک کونسل کی چیئر پرسن محترمہ فہمیدہ ریاض کی نامزدگی پر جالب صاحب کی تمام شاعری کے اعتراف میں انہیں اس وقت کی وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے گولڈ میڈل اور ایک لاکھ روپے بطور جمہوریت ایوارڈ دیے۔

سوھن سنگھ جوش ایوارڈ: 1990

لندن کے ساؤتھ ہال میں پنجابی ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری شیر جنگ رام جی نے سوہن سنگھ جوش ایوارڈ جالب صاحب کو پیش کیا۔

قومی فلم ایوارڈ1990

حکومت پاکستان کی جانب سے قومی فلم ایوارڈ بہترین نغمہ نگار فلم ''کالے چور'' کے لیے حبیب جالب کو بعد از مرگ دیا گیا۔

گریجویٹ ایوارڈ: 1990

بہترین نغمہ نگار فلم ''کالے چور''

نگار ایوارڈ: 1991

فلم ''وطن کے رکھوالے'' کے لیے بہترین نغمہ نگار کا ایوارڈ مدیر ہفت روزہ نگار جناب الیاس رشیدی نے جالب صاحب کو شیخ زید ہسپتال لاہور میں پہنچایا۔

نشان امتیاز : 1994

بعد از مرگ حبیب جالب کے لیے حکومت پاکستان کی جانب سے صدر پاکستان محمد فاروق لغاری نے پیش کیا۔ جسے بیگم ممتاز جالب نے وصول کیا۔

اپنی تو داستاں ہے بس اتنی
غم اُٹھائے ہیں، شاعری کی ہے

Hasnain Sialvi

بہت مہربان تھیں وہ گل پوش راہیں

ہمارے ابا کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ یہ واقعہ ہے لگ بھگ 1910 کا ابا کا لڑکپن کا زمانہ۔ ہم لوگ گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ہمارا گاؤں ''میانی افغاناں'' جسے ''میانی پٹھاناں'' بھی کہا جاتا ہے، آج بھی مشرقی پنجاب (انڈیا) ضلع ہوشیار پور تحصیل دسوہیہ میں اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ اس زمانے میں مساجد ہی مدرسے کا کام بھی انجام دیتی تھیں۔ مسجدوں کے امام عالم فاضل ہوتے تھے، انہیں عربی، فارسی، اردو و ہندی پر عبور حاصل ہوتا تھا۔ اور نسل در نسل علم و فضل کا یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ہمارے ابا بچپن میں ہی نماز پنجگانہ کے عادی ہو گئے تھے اور سنِ بلوغت کو پہنچتے پہنچتے چہرے پر داڑھی کے جو بال آئے تو پھر عمر بھر داڑھی نہیں منڈوائی، یوں مٹھی بھر داڑھی تاحیات ان کی شخصیت کا حصہ رہی۔ ابّا اردو پڑھنا اور لکھنا خوب جانتے تھے اور بہت خوش خط بھی تھے۔ داستان امیر حمزہ، میر امن کی باغ و بہار اور گلستان بوستان، یہ کتابیں ابا نے اپنے تایا فضل محمد کے دوست عبداللہ خان ذیلدار سے پڑھ رکھی تھیں۔

پیشے کے اعتبار سے ہمارے ابا جفت ساز تھے، پنجابی جوتی پر طلع کاری کے ماہر تھے۔ یہ کام بڑا باریک ہوتا ہے اور اس پر محنت بھی بہت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ جوتی بہت مہنگی بنتی تھی اور عام طور پر شادی بیاہ کے موقع پر دولہا دلہن کے لیے ہی بنائی جاتی تھی۔ کبھی جوتی بن گئی تو کچھ پیسے مل گئے، یوں گھر کی گزر اوقات میں ہماری والدہ صاحبہ بھی ابا کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ ابا نے سینکڑوں صفحات کی صورت قلمی نسخہ جات چھوڑے ہیں۔ قیام پاکستان کے چند سال بعد ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے بیٹوں (مشتاق مبارک اور حبیب جالب) نے ان کا کام چھڑوا دیا اور یوں

ابا فارغ اوقات میں لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ ابا نے اپنے بڑے بیٹے مشتاق مبارک (سابق ڈائریکٹر مرکزی محکمہ اطلاعات ونشریات اور اردو کے ممتاز ومعروف شاعر) کے انتقال (27 جولائی 1969) کے بعد 1970 میں ایک کتاب بنام ''گلہائے عقیدت'' ترتیب دی جو حسینیہ پرنٹنگ پریس بوہڑ گیٹ ملتان میں چھپی۔ اس کتاب کے دیباچے میں ابا اپنے خاندانی پس منظر کو یوں بیان کرتے ہیں:

(1) ''ہمارا گاؤں میانی افغاناں مشرقی پنجاب میں دوآب کی سرزمین جسے ''دوآبہ بہشت کا گلابہ'' بھی کہتے ہیں، اس بہشت کے گلاب میں دریائے بیاس کے کنارے آباد تھا اور آج بھی ہے۔ یہ سرسبز و شاداب علاقہ جہاں ندیاں نالے، نہریں بہتی تھیں مہمند پٹھانوں کی ملکیت تھا۔ مہمند پٹھان بڑے باوقار، صاحب علم اور زندہ دل لوگ تھے۔ ہمارے گاؤں کی آبادی تقریباً چھ ہزار (تقسیم سے پہلے) تھی، میونسپل کمیٹی، مڈل اسکول ہسپتال اور پولیس چوکی گاؤں میں یہ سہولتیں موجود تھیں۔ میانی 'میادی، لالو ملاح یہ چند بستیاں بھی دریائے بیاس کے کنارے آباد تھیں، پہلے یہاں مچھیرے آباد تھے۔ بعد ازاں عرب مسلمان کابل قندھار اور غزنی سے ہوتے ہوئے پورے ہندوستان میں پھیل گئے۔ ہم لوگ غزنی (افغانستان) سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور ''میانی افغاناں'' آباد کیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انگریز سرکار سے وفاداری نبھانے کے عوض مسلم پٹھانوں کو گاؤں میانی بطور جاگیر عطا کیا گیا جو بعد میں میانی افغاناں کہلایا۔

دوآبے کی سرزمین نے بہت بڑے بڑے اور نامور لوگ پیدا کیے۔ بیدار مغز انسان، مردِ میدان جری بہادر نامور پہلوان، اولوالعزم بزرگان عظام اور فارسی، اردو، پنجابی کے شاعر و ادیب حضرت مولانا غلام قادر گرامی، حضرت مولوی غلام رسول عالم پوری، حضرت حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیارپوری و طفیل

ہوشیار پوری، منیر نیازی و دیگر۔ میری جھولی میں بھی قدرت نے ایک انمول ہیرا ڈالا کہ جسے دنیا حبیب جالب کے نام سے جانتی ہے۔ میں اس عطاءِ ربی پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔"

ہمارے مورث اعلیٰ بابا خیرالدین خان

ہمارے گاؤں میانی افغاناں میں ایک بزرگ حضرت بابا فتح محمد خان بھی رہتے تھے۔ حضرت بابا فتح محمد خان کا چہرہ بڑا نورانی تھا اور سبھی آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ بابا فتح محمد خان کی ایک بڑی خاص خوبی یہ تھی کہ آپ علاقے کے بڑے تاریخ دان تھے اور آپ کو گاؤں بھر کے مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائیوں کی پشتوں کے نام حفظ تھے۔ جب بھی گاؤں کا کوئی آدمی بابا جی کو سلام کرتا تو جواب میں بابا وعلیکم السلام کہنے کے بعد سلام کرنے والے کو اس کے جدامجد کے حوالے سے پکارتے۔ مثلاً "آ بھئی جھنڈے خان والے" آ بھئی ذیل سنگھ والے، آ بھئی ہری چند والے، اسی طرح ہمارے والد اور بابا فتح محمد خان کا جب بھی آمنا سامنا ہوتا وہ انہیں سلام کرتے تو وہ کہا کرتے تھے "آ بھئی خیر دین خان والے۔"

حبیب جالب کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم ان کے خاندانی پس منظر، خاندانی بود و باش اور وہ تمام مصائب و آلام، جن سے جالب کے بڑے بزرگ گزرے، اس کی جان کاری حاصل کر سکیں۔ یہ درست ہے کہ حبیب جالب جیسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے انسان اللہ تعالیٰ کبھی کبھار ہی پیدا کرتا ہے۔ جن میں وہ بہت سے اپنے اوصاف بھی رکھ دیتا ہے۔ جالب کی بے نیازی، بے خوفی، صبر، جرأت، قناعت سر اٹھا کر چلنا وغیرہ، یہ تمام صفات کیونکر جالب کی ذات میں سما گئیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں اور پھر اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ جالب جیسے انسانوں کا کوئی خاندان، علاقہ، قبیلہ نہیں ہوا کرتا۔ یہ لوگ تو خدا کے بھیجے ہوئے خاص بندے ہوتے ہیں جو دنیا میں اپنا کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ خدا کی

مرضی و منشاء ہے کہ وہ اپنے ایسے خاص بندوں کو کہیں بھی کسی بھی خاندان میں پیدا کر دے۔ اور یوں خدا نے ہمارے خاندان کو یہ عزت بخشی کہ حبیب جالب کو ہمارے ہاں پیدا کر دیا۔ جالب جیسے جتنے لوگ جو بھی دنیا سے گزرے ہیں ان سب کا خاندانی پس منظر بھی منفرد اور دلچسپ کہانی لیے ملتا ہے۔ اسی لیے میں خصوصاً اس بات کا خیال رکھتے ہوئے حبیب جالب کے والد یعنی ہمارے ابا کی تحریری گواہی پیش کر رہا ہوں تا کہ پڑھنے والے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ حبیب جالب کے بارے میں مکمل اور درست جانکاری حاصل کر سکیں تو آیئے وہاں چلتے ہیں جہاں حبیب جالب کے والد رقم طراز ہیں:

(2) ''خیر الدین خان میرے والد میاں جی شرف الدین کے دادا تھے۔ ہمارے مورثِ اعلیٰ بابا خیر الدین خان کے بارے میں بابا فتح محمد خان فرمایا کرتے تھے کہ خیر الدین خان بڑے قوی ہیکل جوان تھے۔ ایسے بہادر اور غیرت مند انسان کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ پھر بابا فتح محمد خان نے بتایا کہ بابا خیر الدین خان غزنی (افغانستان) سے ہجرت کر کے یہاں آئے تو ضلع جالندھر میں واقع قلعہ پھلور میں فوجی ملازمت اختیار کر لی۔ 1857 کی جنگِ آزادی میں جب انگریزوں نے قلعہ پھلور پر بھی یلغار کی تو خیر الدین خان اپنے فوجی ساتھیوں سمیت قلعہ پھلور میں محصور ہو کر رہ گئے۔ اس موقع پر خیر الدین خان نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے جواں مردوں کی موت مرنا ہی مردانگی ہے۔'' اس کے بعد خوب جان توڑ مقابلہ ہوا۔ اور گورے سپاہی پسپا ہو کر بھاگ نکلے اور کچھ گورے سپاہی قلعہ کی بالائی منزل پر جا چھپے۔ جوش و ولولے کے عالم میں خیر الدین خان نے تنہا ان گورے سپاہیوں کا تعاقب کیا اور قلعہ کی بالائی منزل پر جا پہنچے اور نو کے نو گورے قتل کر ڈالے۔ آخر گوروں کی مزید فوجی کمک آ جانے پر خیر الدین خان گرفتار ہوئے اور انہیں انگریز افسر کے سامنے پیش کرتے ہوئے بتایا گیا کہ اس نوجوان نے نو گورے فوجیوں کا قتل کیا ہے۔ جو اپنی جان بچانے کی خاطر قلعہ پھلور کی بالائی منزل پر جا چھپے تھے انگریز افسر سارا ماجرا سن کر بولا ''وہ بزدل تھے جو میدان چھوڑ بھاگے جب کہ

یہ جواں بہادر ہے، غیرت مند ہے۔" بابا فتح محمد کے کہنے کے مطابق بعدازاں ہمارے مورثِ اعلیٰ خیرالدین خان نے میانی افغاناں میں رہائش اختیار کرلی۔ جہاں وہ پولیس چوکی میں آٹھ سپاہیوں پر جمعدار کے منصب پر فائز ہوئے۔

بابا فتح محمد خان، بابا خیرالدین خان کی پولیس ملازمت کے زمانے کا ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ شدید بارش میں بابا خیرالدین خان پولیس چوکی میں اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ رات کا وقت تھا۔ سارے سپاہی گشت پر گئے ہوئے تھے۔ بارش اس قدر شدید تھی کہ پولیس چوکی کی چھت گرنے لگی۔ خیرالدین خان نے یہ دیکھا تو لکڑی کے بالے سے چھت کے شہتیر کو ٹیک لگا کر تمام رات پولیس چوکی کی گرتی چھت کو سنبھالے رکھا۔ صبح جب سپاہی گشت سے لوٹے تو انہوں نے خیرالدین خان کو باہر نکالا۔ مگر اس واقعے کے بعد تمام عمر بابا خیرالدین کی ریڑھ کی ہڈی میں درد بیٹھ گیا اور اسی لیے وہ کمر میں لوہے کی زنجیر باندھ کر رکھتے تھے اور کمر کے اس درد نے زندگی بھر ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ہمارے انہی بہادر، غیر مند بزرگ کی کوئی "انی کنی" میرے بیٹے حبیب جالب میں رہ گئی ہے۔"

ہمارا خاندان مزاجاً پیروں فقیروں سے عقیدت رکھنے والا خاندان ہے۔ بزرگان دین اور اولیاء اللہ کے مزارات پر مودبانہ حاضری ہمارا عقیدہ ہے۔ نذر نیاز کے بھی ہم قائل ہیں۔ ہمارے دادا شرف الدین خان اور ہمارے والد، بابا سید حسین شاہ قادریؒ کے مرید تھے اور ان کے فیوض و برکات کا روحانی سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ ہمارے والد صاحب ہر ماہ کے چاند کی گیارہویں تاریخ پر حضرت سیدنا غوث الاعظمؓ کی نیاز (غریبانہ طور پر) ضرور دلاتے تھے۔ ابا کا معمول تھا کہ روزانہ بعد نماز فجر ایک پارہ قرآن شریف کا پڑھتے پھر درود تاج پڑھتے اور آخر میں اپنا بنایا ہوا "وظیفہ قادریہ" پڑھتے جس میں تمام بزرگان دین کے اسماء پاک شامل تھے۔ اور قرآن پاک درود تاج کے پڑھنے کا ثواب حضور نبی کریمؐ کی وساطت سے تمام انبیاء شہداء اولیا اللہ، پیر، فقیر اللہ کے نیک بندوں اور اپنے خاندان کے بزرگوں کی روحوں کو پہنچاتے اور دم کیا ہوا پانی

تمام گھر والوں کو تھوڑا تھوڑا پلاتے۔

ہمارے خاندان نے بٹوارے کے وقت دہلی سے کراچی ہجرت کی تھی دہلی میں ہمارے سب سے بڑے بھائی مشتاق مبارک محکمہ اطلاعات و مطبوعات حکومت ہند میں ملازم تھے جب بھائی نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تو محکمہ نے انہیں پاکستان کے دارالخلافہ کراچی رپورٹ کرنے کی ہدایات جاری کرتے ہوئے خاندان کے لیے ریل گاڑی کے ٹکٹ فراہم کیے، اور یوں ہم 14راگست 1947 کے دن کراچی پہنچ گئے۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ کیسے کراچی پہنچے، بہر حال پہنچ گئے۔ والد صاحب اپنے عقیدے اور مزاج کے مطابق اپنی دہلی سے کراچی ہجرت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

(3) ''اور پھر ہم حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے قدموں سے اٹھ کر بابا عبداللہ شاہ غازیؒ کے قدموں میں آ بیٹھے'' (اس فقرے میں ہمارے خاندانی عقیدے اور مزاج کی بھرپور عکاسی ہو جاتی ہے)۔

کراچی میں جٹ لینڈ لائنز کی بلاک نمبر 35 کا کوارٹر نمبر 3 ہمارے بڑے بھائی مشتاق مبارک صاحب کو سرکار کی طرف سے الاٹ کیا گیا۔ اس کوارٹر میں ہم نے 22 سال گزارے۔ بھائی مشتاق محکمہ جاتی ترقیاں پاتے رہے اور انہیں بہتر اور اچھے علاقوں میں رہائش گاہیں آفر ہوتی رہیں۔ مگر بھائی ''جہاں بیٹھ گئے سو بیٹھ گئے'' کے مصداق کہیں نہیں گئے۔ جٹ لائن ہی میں ہمارے سامنے والے بلاک میں حضرت پیر ضیاء القادریؒ بھی رہتے تھے جو معروف شاعر شکیل بدایونی کے سگے چچا تھے ایک بار شکیل صاحب بمبئی سے اپنے چچا کے ہاں آئے تو ہمارے گھر جالب صاحب سے ملاقات کے لیے بھی آئے۔ ہمارے والد صاحب حضرت ضیاء القادریؒ صاحب کے ''حلقہء ارادت'' میں شامل ہو گئے۔ حضرت خود بھی شاعر تھے اور شعراء کو پسند بھی کرتے تھے۔ والد صاحب کے اصرار پر حضرت ضیاء القادریؒ کے ہاں منعقد ہونے والے چند نعتیہ مشاعروں میں جالب صاحب نے بھی شرکت کی۔ مگر نعت میں بھی ان کا اپنا انداز اور رنگ

ضرور جھلکتا تھا۔ یہ پچاس کی دہائی کی بات ہے کہ جب حضرت پیر ضیاء القادریؒ نے والد صاحب کی عبادت ریاضت پر انہیں ''صوفی'' کے منصب پر فائز فرمایا۔ اور یوں ہمارے والد صاحب اپنے نام کے ساتھ صوفی لکھنے لگے۔ اب میں پھر والد صاحب کی تحریر کا سہارا لوں گا۔ جسے پڑھ کر ہمارے صوفیانہ خاندانی مزاج سے مزید آگاہی حاصل ہو سکے گی۔''

والد صاحب لکھتے ہیں:

(4) ''میرے والد میاں جی شرف الدین دس بارہ سال کی عمر میں والدین کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ والد صاحب کے بڑے بھائی میاں جی فضل (میرے تایا جی) پیشے کے اعتبار سے ''گائیڈ'' تھے اور بڑے اچھے باورچی بھی تھے۔ ہندوستان کی سیاحت کو جو غیر ملکی آتے تھے میرے تایا فضل محمد ان سیاحوں کے ساتھ ہندوستان بھر گھومتے یوں ان کا زیادہ وقت کلکتہ، مدراس، بمبئی، دہلی، آگرہ وغیرہ میں گزرتا تھا۔ جبکہ میرے والد میاں جی شرف الدین خان گاؤں میں تنہا رہتے تھے۔ گاؤں میانی افغاناں میں میرے والد صاحب کا قریبی رشتہ دار، چچا، تایا، ماموں، پھوپھی کوئی نہیں تھا۔ بس یہ دو بھائی تھے۔ بڑا بھائی گاؤں سے باہر رہتا اور میرے والد گاؤں میں بے یارو مددگار، لاوارثوں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور۔ دور پرے کے عزیز واقارب ایک لاوارث نوجوان کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ گویا والد صاحب اپنے خاندان کا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ تھے۔ جسے بادِ مخالف کا ہلکا سا جھونکا بھی بجھا سکتا تھا۔ مگر قدرت جس کا ہاتھ تھام لے، پھر بھلا ہزار آندھیاں بھی چلیں تو کیا فرق پڑتا ہے اور پھر یوں ہوا کہ اللہ نے اپنے ایک مقرب بندے حضرت پیر حسین علی شاہؒ کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دے دیا۔ میرے والد میاں جی شرف الدین خان نے اپنے پیرو مرشد بابا حسین شاہؒ صاحب کو دیکھا، رنگ و نور کی کرنیں بابا حسین شاہؒ صاحب کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں، پیر کامل کی نظر سے نظر ملنا تھی کہ قبلہ والد صاحب نے بابا جی کے قدموں میں بیٹھنے کی اجازت مانگی اور اس طرح گاؤں میانی افغاناں کے لاوارث شرف الدین کو حضرت پیر حسین شاہؒ صاحب کے حلقہ ارادت میں جگہ مل گئی۔''

قبلہ والد صاحب بابا حسین شاہؒ صاحب کے مرید کیا ہوئے ان کی زندگی ہی بدل گئی۔ دس بارہ سال کا لاوارث بچہ، جسے قدرت نے ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھنا تھا۔ اب یہ حال تھا کہ قبلہ والد صاحب کے دن رات اپنے پیر کے آستانے پر گزرنے لگے اور یوں وہ اپنے مرشد ہی کے ہو کر رہ گئے اور ان کی عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا کہ۔

جگہ نہیں ہے مرے دل میں تل بھی دھرنے کو
ہیں اس قدر مری نظروں میں وہ سمائے ہوئے

میانی افغاناں میں ہماری کوئی جاگیر وغیرہ کچھ بھی نہیں تھا، بس ایک کچا سا مکان تھا مگر قبلہ والد صاحب اپنے پیر و مرشد کے آستانے پر ہی رہتے تھے۔ لمبا چوغا بدن پر سر پر پگڑی اور مرشد کی اطاعت، قبلہ والد صاحب کی زندگی اسی رنگ ڈھنگ میں گزرنے لگی۔

وقت گزرتا گیا اور قبلہ والد صاحب بھی بچپنے کی حدود پھلانگ کر اب جوانی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ مگر کامل پیر کی محبت نے لغویات دنیا سے یکسر محفوظ کر رکھا تھا۔ قبلہ والد صاحب کے شب و روز آستانہ پیر حسین علی شاہؒ پر گزر رہے تھے اور پیر و مرشد بھی اپنے مرید شرف الدین سے بہت محبت کرتے تھے۔

ایک مرتبہ قبلہ والد صاحب نے اپنے پیر و مرشد سے عرض کیا کہ ''حضرت ہماری نسل میں بہت سے بزرگ ایسے ہیں جو لاولد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ میں نے سنا ہے ہمارے ان بزرگوں میں سے کسی نے نوشاہی خاندان کے بزرگ کی شان میں گستاخی کی تھی، یا پیر و مرشد اس دنیا سے لاولد جانے والے ہمارے بزرگوں کے یہ نام ہیں:

میاں چتر داد خان

میاں روڑے خان (ٹانڈہ اڑمڑ)	میاں حیدر داد خان
میاں غلام مصطفیٰ خان	میاں غلام محمد خان
میاں پیر محمد خان	میاں محمد بخش اور میاں احمد بخش خان

ہمارے ان بزرگوں پر نوشاہی بزرگ کی شان میں گستاخی کرنے کی وجہ سے عتابِ الٰہی نازل ہوا اور یہ دنیا سے لاولد ہی رخصت ہو گئے۔ پیرو مرشد بابا حسین شاہؒ صاحب نے تمام ماجرا اپنے مرید خاص سے سنا تو اسے کہا کہ فوراً ساتھ والے گاؤں ''جھنڈ چھانگلے'' چلے جاؤ۔ وہاں نوشاہی بزرگ حضرت پیر امام الدین شاہؒ تشریف لائے ہوئے ہیں۔

میانی افغاناں سے ''جھنڈ چھانگلہ'' دو اڑھائی میل دور تھا۔ حضرت پیر امام الدین حضرت پیر بخت جمال کے پوتے تھے۔ جو چند یوم سے موضع ''جھنڈ چھانگلے'' اپنے مریدوں کے پاس تشریف لائے ہوئے تھے۔ مرشد طریقت نے اپنے صادق الیقین مرید کو گرمیوں کی تپتی ہوئی دو پہر میں حکم صادر فرمایا دیا تھا کہ حضرت امام الدینؒ نوشاہی بزرگ کی خدمت میں پیش ہو جائے۔ لہٰذا شرف الدین خان حسب الحکم شدید گرمی کے عالم میں تپتی دو پہر ہی میں موضع ''جھنڈ چھانگلے'' کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور اپنے مرشد سے یہ بھی نہ پوچھا کہ حضرت پیر امام الدین نوشاہیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر کیا عرض کروں۔

مرشد کے حکم کی تعمیل میں پیدل ہانپتے کانپتے میاں جی شرف الدین خان جھنڈ چھانگلے'' پہنچ گئے۔ بھیجنے والے بھی باکمال اور ادھر حضرت امام الدین نوشاہیؒ بزرگ بھی باطن کی آنکھ رکھنے والے۔

میاں شرف الدین خان جب وہاں پہنچے کہ جہاں پیر سید امام الدین نوشاہیؒ تشریف فرما تھے تو آپ نے دیکھا کہ حضرت امام الدین شاہؒ اپنے مریدوں کے جھرمٹ میں مانند ماہتاب تشریف فرما ہیں۔ قبلہ والد صاحب نے مودبانہ سلام عرض کیا۔ پیر امام الدین شاہؒ نے سلام کا جواب دیا اور مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ قبلہ والد صاحب ابھی کھڑے ہی تھے اور منتظر تھے کہ پیر امام الدین شاہ نوشاہیؒ انہیں بیٹھنے کی اجازت دیں گے مگر نوشاہی بزرگ نے شرف الدین کو بیٹھنے کی بجائے یہ فرمایا ''چلو بھئی شرف دین تم کھو (کنواں) پر چل کر ہمیں نہلاؤ۔''

پیر امام الدین شاہؒ کی بات سن کر ان کے تمام مرید باادب کھڑے ہو گئے اور اپنے مرشد کی خدمت میں عرض کرنے لگے کہ ''یا مرشد آپ ہمیں حکم دیں ہم آپ کو نہلاتے ہیں''

مگر پیر سید امام الدینؒ نے اپنے مریدوں کی خواہش کو رد کرتے ہوئے پھر کہا کہ ''آنے والا شرف الدین ہی ہمیں نہلائے گا'' مریدین میں سے دو ایک نے پھر ہمت کی اور کہا کہ ''یا مرشد شرف الدین سخت گرمی میں پیدل چل کر آیا ہے۔ یہ تھکا ہارا ہے، آپ یہ خدمت ہمیں انجام دینے کی اجازت دیں'' مگر اس بار بھی پیر سید امام الدینؒ نے اپنے مریدوں کی بات کو منظور نہیں کیا۔ اور وہی بات دھرائی کہ ''ہمیں یہی شرف الدین جو سخت چلچلاتی دھوپ میں پیدل سفر کر کے آیا ہے، ہمیں نہلائے گا۔''

مرشد کا دوٹوک فیصلہ سن کر تمام مریدین خاموش ہو گئے۔ اب قبلہ والد صاحب میاں جی شرف الدین، حضرت پیر سید امام الدین نوشاہیؒ کے ساتھ قریب ہی واقع کنوئیں پر چلے گئے۔ پیر صاحب کنوئیں کے قریب پتھر پر لنگوٹہ کس کر بیٹھ گئے اور شرف الدین خان نے کنوئیں کا ٹھنڈا پانی بوکی (رسی سے بندھا برتن، جس سے کنوئیں کا پانی نکالا جاتا ہے) بھر بھر کر حضرت پیر صاحب کے جسم مبارک پر ڈالنا شروع کر دیا۔

تپتی دوپہر میں کنوئیں کے ٹھنڈے پانی سے نوشاہی بزرگ کی طبیعت سیراب ہو رہی تھی اور پھر اسی سیرابی کی کیفیت میں حضرت امام الدین شاہؒ نوشاہی نے نہلانے والے شرف الدین کے لیے دعائیہ کلمات ادا کرنے شروع کر دیے۔

''واہ بھئی شرف دین تم نے ہمیں خوش کیا اللہ تمہیں خوش کرے''

''واہ بھئی شرف دین تم نے ہمیں ٹھنڈے پانی سے شاداب کیا اللہ تمہاری نسل کو سرسبز و شاداب کرے''

''واہ بھئی شرف دین تم نے ہمیں سیراب کیا اللہ تمہاری آل اولاد کو خوشیوں سے سیراب کرے''

جوں جوں میاں جی شرف الدین نوشاہیؒ بزرگ کے جسم مبارک پر کنوئیں کا ٹھنڈا پانی ڈالتے تھے نوشاہی بزرگ اپنے خزانے کے لعل و گہر دعاؤں کی صورت شرف الدین پر نچھاور کرتے تھے۔

حضرت پیر امام الدین نوشاہیؒ بزرگ کے فیض اور مرادوں سے جھولی بھر کر جب قبلہ والد

صاحب واپس اپنے پیرو مرشد کے آستانے پہنچے تو ان کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ نوشاہی بزرگ کی دی ہوئی بد عا اب بفضل تعالیٰ دعا میں بدل چکی تھی۔ اور یہ زندہ معجزہ ہے کہ ہماری نسل میں عرصہ دراز بعد صرف میرے والد میاں جی شرف الدین خان کو اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نوازا اور مجھ سمیت مبارک علی، صادق علی اور اقبال محمد ہم چار بھائی اور ایک بہن خدیجہ بی بی پیدا ہوئے جبکہ میرے والد صاحب کے بڑے بھائی میرے تایا فضل محمد دو شادیوں کے باوجود لاولد ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب بزرگوں کی دعائیں ہیں۔ اور اللہ کو یہی منظور تھا کہ یہ نسل آگے بڑھے پھلے پھولے۔

سادھو بولے یہ سبھا

سادھو کا بولا ورتھ نہ جا

اللہ اپنے ہونے کا احساس قدم قدم پر اپنے بندوں کو دلاتا ہے جو نسل تقریباً ختم ہو گئی تھی اور ان کے صرف دو فرد باقی رہ گئے تھے، ان دو میں سے بھی صرف ایک کو اولاد عطاء فرمائی۔ اور یہ بزرگوں کی دعائیں سمیٹنے والا شرف الدین خان حبیب جالب کے دادا تھے۔ جن کے بڑے بیٹے صوفی عنایت اللہ خان کے ہاں حبیب جالب نے رابعہ بصری کے بطن سے جنم لیا۔

ہماری والدہ صاحبہ کردار کے حوالے سے اسم با مسمیٰ تھیں۔ بڑی جلالی، بڑے بڑے چیلنج قبول کرنے والی، طوفانوں سے ٹکرا جانے والی، منہ پر سچ بولنے والی، نہ ڈرنے والی، نہ جھکنے والی، نہ تھکنے والی۔

بات کچھ بھی تو نہیں، حبیب جالب کردار کے حوالے سے اپنی والدہ صاحبہ کی ہو بہو تصویر تھے۔ والدہ صاحبہ کا بڑا مشہور فقرہ ہے۔ جو انہوں نے ضلع کچہری لاہور میں ادا کیا تھا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا زمانہ تھا۔ 1964 پولیس والے جیل سے ہتھکڑی لگا کر حبیب جالب کو لیکر کورٹ پہنچے، ماں پہلے سے وہاں موجود تھی، بیٹے کو ہتھکڑی میں دیکھا تو برداشت نہ ہوا اور پولیس انسپکٹر سے کہا ''اوئے تھانیدار ا میرے بیٹے کی ہتھکڑی کھول دے، یہ بھاگے گا نہیں اس لیے کہ میں نے ہمیشہ جاگتے میں اسے دودھ پلایا ہے۔ یہ بزدل نہیں ہو سکتا'' اور نہ معلوم کیا وجہ تھی یا اماں کے کہنے

کی تاثیر کہ پولیس والے نے جھکڑی کھول دی۔ بعد کو اماں نے وضاحت کرتے ہوئے کئی بار اس بات کو دھرایا کہ اگر میرے بچے کو رات میں بھوک لگی تو پہلے میں خود جاگی ہوں۔ بستر پر بیٹھ کر مکمل طور پر جاگنے کے بعد بسم اللہ کر کے میں نے بچے کو دودھ پلایا۔

یہ ہماری والدہ ہی تھیں جس کی وجہ سے ہم بہن بھائی پڑھ لکھ گئے۔ والد صاحب تو بہت نرم خو دھیمے لہجے کے مالک تھے، مگر والدہ صاحبہ تو سینہ ٹھونک کر گاؤں کے ''بڑوں'' کے سامنے کھڑی ہو گئیں تھیں ''بڑے'' چاہتے تھے کہ عنایت اللہ اور رابعہ بصری کے بچے نہ پڑھیں اور اماں کی ضد تھی کہ میرے بچے ضرور تعلیم حاصل کریں گے۔ اور نہایت غربت و عسرت کے باوجود اماں نے بالآخر اپنے بڑے بیٹے مشتاق حسین کو میٹرک پاس کروالیا۔ یہ 1939 کا واقعہ ہے۔ اماں نے اپنے بیٹے مشتاق کو میٹرک کروانے کی خاطر اپنا گاؤں چھوڑ دیا اور اماں، ابا، میانی افغاناں سے ہجرت کر کے ''ٹانڈہ اڑمڑ'' آ بسے۔ وہ لمحہ کیا لمحہ تھا کہ جب رابعہ بصری کے کانوں میں یہ آواز آئی ''مبارک ہو تیرا بیٹا مشتاق میٹرک کے امتحان میں پاس ہو گیا۔'' ہمارے خاندان کا پہلا میٹرک پاس۔ بھائی مشتاق کو گاؤں کے ایک 'بڑے' نے جو یقیناً بڑا نیک انسان تھا۔ جناب غلام سرور خان صاحب (جو دہلی میں محکمہ اطلاعات و مطبوعات حکومت ہند میں آفیسر تھے) نے وعدہ نبھاتے ہوئے اپنے ہی محکمہ میں بابو بھرتی کروادیا تھا۔ غلام سرور خان صاحب کی بیگم جن کا نام حمیدہ تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی بہت اچھے انسان تھے۔ خصوصاً حمیدہ بی بی کو ہماری اماں سے بڑا پیار تھا۔ ہر ماں کی طرح ہماری والدہ صاحبہ بھی خصوصاً اپنے بڑے بیٹے مشتاق کو لوری دیتے ہوئے زمانے بھر کے خطابات اسے دیتی تھیں۔ عرش کا تارا، میرا مشتاق دِلی کا شہزادہ۔ میرا مشتاق وائسرائے کے دفتر کا افسر۔ ''اے لو میرے مشتاق کی بھوں بھوں کرتے گڈی (کار) آ گئی۔ ''اے لو اب گڈی دفتر پہنچ گئی'' ''چپراسی گڈی کا دروازہ کھول رہا ہے'' سب جھک جھک کر مشتاق کو سلام کر رہے ہیں'' یہ شیخ چلی نما لوری سن سن کر حمیدہ بیگم اور غلام سرور خان بہت متاثر اور خوش ہوتے تھے اور پھر ہماری والدہ صاحب کی شیخ چلی والی اس لوری کو اللہ تعالیٰ نے سچ کر دکھایا۔

ہمارے بھائی مشتاق ساٹھ کی دہائی میں مرکزی محکمہ اطلاعات و مطبوعات حکومت پاکستان میں گزٹیڈ آفیسر درجہ اول بن گئے اور محکمے کی کار میں وہ گھر آتے جاتے تھے۔ اور وہ سب کچھ جو اماں لوری دیتے ہوئے کہتی تھیں۔ اماں اور ابا جی نے اور خود میں نے بھی وہ سب کچھ حقیقت میں دیکھا۔ کار کا دروازہ ڈرائیور کھول رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ دو تین سال قبل ''مدرڈے'' کے موقع پر علی برادران کی عظیم ماں ''بی اماں'' کے ساتھ ہماری اماں کے بارے میں بھی ہفت روزہ اخبار جہاں میں اماں کی یہی لوری والا قصہ شائع ہوا تھا جو بیان کیا جا چکا ہے۔

اپنے بڑے بیٹے مشتاق کے بعد اماں اپنے دوسرے بیٹے حبیب کے بارے میں بھی یہی سوچ رکھتی تھیں کہ وہ بھی میٹرک پاس کر کے بابو بھرتی ہو جائے۔ مگر اللہ کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قدرت کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھی، حبیب ساتویں جماعت کا اردو کا امتحان دے رہا تھا۔ پرچے میں ''وقتِ سحر'' کا جملہ بنانے کو کہا گیا تھا حبیب سے جملہ تو نہ بن پایا، البتہ شعر ہو گیا۔ حبیب نے جملے کی بجائے شعر کہا اور لکھ دیا۔

وعدہ کیا تھا آئیں گے امشب ضرور وہ
وعدہ شکن کو دیکھتے ''وقتِ سحر'' ہوا

سالانہ امتحان کے پرچے میں حبیب کے کلاس ٹیچر یقین شاہ صاحب نے جب یہ شعر پڑھا تو بہت خوش ہوئے اور بہت حیران بھی اور انہوں نے حبیب سے کہا ''اوئے حبیب تیں تاں شاعر آں بھئی (اوئے حبیب تم تو شاعر ہو بھئی) اور پھر یقین شاہ صاحب شام میں والد صاحب سے ملنے کے لیے گھر آئے اور والد صاحب کو بھی یہ خوش خبری سنائی کہ آپ کا بیٹا حبیب شاعر ہے۔ ہمارے ابا یہ سن کر بڑے خوش ہوئے۔ مگر ساتھ والے کمرے میں ہماری والدہ صاحبہ نے جب یہ سنا تو وہ بے ہوش ہو گئیں۔ سب گھر والے پریشان ہو گئے۔ اور اماں کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد جب انہیں ہوش آیا تو وہ بہت بری طرح رو رہی تھیں۔ وہ بہت غم زدہ تھیں اور بار بار کہہ رہی تھیں ''اے اللہ تو اپنا رحم فرما دے میرے بیٹے کو سیدھی راہ دکھا دے تو ہی اسے بچا لے ارے میں لٹی گئی میرا بیٹا ''شیئر'' نکل گیا۔'' (ارے میں لٹ گئی میرا بیٹا شاعر بن گیا)۔

ابا نے لاکھ اماں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ شاعری کوئی برا کام نہیں ہے۔ مگر اماں کسی کی ایک بھی نہیں سن رہی تھیں اور مسلسل چیخ چیخ کر رو رو کر خدا سے التجائیں کر رہی تھی کہ ''اے اللہ میرے بچے حبیب کو آوارہ ہونے سے بچالے'' اے اللہ یہ لچے لفنگے لوگوں کا کام ہوتا ہے تو میرے حبیب کو بچالے۔''

ننھا حبیب بھی خوف زدہ سا ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ باپ خوش ہے اور ماں غم و غصے سے نڈھال بے حال ہو رہی ہے۔ اور پھر اماں نے اسی وقت دہلی سے گاؤں جانے کا فیصلہ کرلیا تا کہ اپنے پیر و مرشد حضرت بابا حسین شاہؒ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر حبیب کے شاعر ہونے کا ماجرا ان کے گوش گزار کرے اور ان سے دعا کی درخواست کرے۔

اماں کے نزدیک تو وہ سارے خواب جو انہوں نے اپنے بیٹے حبیب کے حوالے سے دیکھے تھے بکھر چکے تھے۔ اور پھر اماں گاؤں چلی گئیں۔ اب جو واقعہ میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں اس کے راوی ہیں معروف ادیب، ناول نگار، ڈرامہ نویس و صدا کار جناب اشفاق احمد۔ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ ہمارے گاؤں کی حمیدہ بیگم جن کے شوہر غلام سرور خان صاحب نے ہمارے بڑے بھائی مشتاق مبارک صاحب کو دلی میں سرکاری ملازم کروایا تھا۔ ان کی بیگم حمیدہ بی بی اشفاق احمد صاحب کی حقیقی خالہ تھیں۔

اشفاق احمد بڑے باکمال انسان تھے۔ اللہ نے انہیں بہت سی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اشفاق صاحب بہت بڑے داستان گو بھی تھے۔ یہ بھی بڑا فن ہے اور اس میں بھی انہیں خاصا ملکہ حاصل تھا۔

ہماری والدہ گاؤں پہنچی تو سیدھی حمیدہ بی بی کے گھر گئیں۔ وہاں اشفاق احمد صاحب کی والدہ صاحبہ اپنی بہن کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ اب آگے اشفاق احمد صاحب سے سنیے۔ اشفاق صاحب نے یہ واقعہ جالب صاحب کی پچاسویں سالگرہ منعقدہ لاہور (1978) تقریب میں سنایا تھا۔ اشفاق احمد سناتے ہیں:

''جب میں گھر میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ میری والدہ اور خالہ جی (والدہ جالب) آپس میں گلے لگ کر زار و قطار رو رہی ہیں۔ میں یہ منظر دیکھ کر پریشان

ہو گیا۔ میں اس وقت نویں یا دسویں جماعت میں ہوؤنگا، میں آگے بڑھا اور اپنی والدہ صاحبہ سے پوچھا ''بی بی کی ہویا (بی بی کیا ہوا) مگر جواب ندارد اور شدید رونا جاری، پھر میں نے خالہ جی سے پوچھا ''خالہ کی ہویا'' مگر انہوں نے بھی کچھ نہ بتایا۔ بس دونوں گلے لگے روئے جا رہی تھیں اور میں مسلسل رونے کا سبب پوچھ رہا تھا۔ آخر بڑی دیر کے بعد میری والدہ مجھ سے بولیں ''وے پتر اشفاق، تیری خالہ تے لٹی گئی، ایہدا انکا پُتر حبیب شیئر نکل گیا'' (ارے بیٹا اشفاق تیری خالہ تو لُٹ گئی اس کا چھوٹا بیٹا حبیب شاعر بن گیا) یہ بتانے کے بعد میری والدہ پھر خالہ کے ساتھ گلے لگ کر رونے لگی۔''

واہ دیکھیے، آنے والے زمانوں کے دو نہایت اہم صاحب اسلوب قلم کاروں کی مائیں کس درجہ سادہ لوح تھی، اشفاق صاحب مزید کہتے ہیں (5) ''میں اور حبیب دریائے بیاس پر مچھلیاں پکڑنے جاتے تھے جالب مجھ سے دو تین سال چھوٹا تھا جبکہ ان کے بڑے بھائی مشتاق مبارک مجھ سے تین چار سال بڑے تھے، جالب کے والد صاحب بہت شریف آدمی تھے، اور نہایت خوش خط بھی تھے، اور خوش خط لکھنا میں نے ان سے سیکھا۔''

ہمارے والدین اپنے بیٹے حبیب کو بھی بڑے بیٹے مشتاق کی طرح میٹرک پاس کروا کے کسی سرکاری دفتر میں بابو بنانا چاہتے تھے۔ مگر جالب صاحب کو تو اللہ نے کچھ اور منصب عطا کر کے دنیا میں بھیجا تھا۔ کچھ اور کام تھے جو اللہ نے ان کے ذمے لگا رکھے تھے اور جنہیں حبیب جالب کو پورا کرنا تھا مگر والدین اللہ کی رضا سے بے خبر، شعر و شاعری سے بیٹے کو باز رہنے کو کہتے، بیٹے کی ڈنڈوں سے پٹائی کرتے، خصوصاً والدہ صاحبہ اس پٹائی والے کام میں زیادہ آگے آگے رہتیں جبکہ والد صاحب والدہ کو سمجھاتے کہ شاعری بری چیز نہیں، یہ بڑا کام ہے، مگر والدہ صاحبہ کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہ تھیں۔ ایک بار جالب بھائی کے کلاس ٹیچر نصر اللہ خان (ممتاز کالم نگار) ہمارے والد

صاحب سے ملاقات کرنے گھر تشریف لائے (یہ 49-1948 کی بات ہے) اور والد صاحب سے کہا (6) ''آپ کا مست (جالب صاحب اس وقت مست تخلص رکھتے تھے حبیب احمد مست میانوی لکھتے تھے) ماشاء اللہ بڑا ذہین نوجوان ہے اور شعر بھی اچھے کہتا ہے۔ میں اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں کہ اسے آپ میری سپردگی میں دے دیں میں اسے اپنے گھر رکھوں گا، اور اس کی پڑھائی کا بھی خیال رکھوں گا۔ ابا نے ذرا سی پس و پیش کے بعد ان کی بات مان لی اور یوں جالب صاحب نصر اللہ خان صاحب کے گھر واقع مارٹن روڈ کراچی (سرکاری کوارٹر) رہنے لگے۔ مست صاحب کا بستر برآمدے میں لگوا دیا گیا۔ انہی دنوں کا قصہ بیان کرتے ہوئے نصر اللہ خان نے اپنے کالم میں لکھا تھا۔ کالم کا عنوان تھا ''ہمارے اسکول کے ہونہار طلباء'' اس کالم میں انہوں نے دو ہی طلباء کا ذکر کیا تھا۔ ایک حبیب جالب اور دوسرے تحریک پاکستان کے صف اول کے رہنما سردار عبدالرب نشتر کے صاحبزادے سابق چیئرمین پاکستان بینکنگ کونسل جمیل نشتر مرحوم کا۔ نصر اللہ خان اپنے کالم میں لکھتے ہیں ''ایک رات مست نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا، ہم گہری نیند سو رہے تھے۔ بیگم کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے مجھے جگایا:

اٹھیے خان صاحب! دیکھیں مست دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ میں بھی اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور بیٹھے بیٹھے ہی مست سے پوچھا

ہاں بھئی مست کیا بات ہے؟

میرے پوچھنے پر مست نے کہا ''حضور ایک غزل ہوگئی ہے ذرا سن لیجئے''

میں نے بیوی اور بیوی نے مجھے دیکھا، اور پھر میں نے مست سے کہا ''ابھی سو جاؤ صبح غزل سنیں گے''

مگر مست پھر بولا ''نہیں حضرت ابھی سن لیجئے''

آخر ہم دونوں میاں بیوی اٹھے، دروازہ کھولا، اور مست کی غزل سنی۔ ایک تو اس کی غزل اور پھر اس کا مسحور کن ترنم۔ مست تو غزل سنا کر گہری نیند سو گیا اور ہم میاں بیوی نے اس کی غزل کے

سحر میں تارے گنتے گنتے رات گزاری۔''

اس زمانے میں میٹرک کا امتحان دینے کے لیے طلباء کراچی سے پنجاب جایا کرتے تھے ابا اماں نے بھی بھائی جالب صاحب کو میٹرک کا امتحان دینے لاہور بھیجا۔ بھائی صاحب نے سارے پرچے دے دیے۔ بس ایک انگریزی کا پرچہ رہتا تھا کہ ایک شاعر حرماں خیر آبادی سے ملاقات ہوگئی۔ جالب صاحب کے شعر سن کر وہ بولے ''تمہارا میٹرک کے امتحان سے کیا تعلق، چلو آج رات کوہ نور ٹیکسٹائل ملز لائل پور میں مشاعرہ ہے'' اور بھائی صاحب امتحان ادھورا چھوڑ لائل پور چلے گئے اور پھر والدین کے ڈر کے مارے واپس کراچی بھی نہ آئے۔ بھائی بہت خوبصورت نوجوان تھے پھر شاعر بھی، اس لیے لائل پور میں موجود دور پرے کے عزیز رشتہ دار انہیں اپنے گھر میں نہیں رکھتے تھے کہ گھر میں جوان لڑکیاں ہیں۔ انہی حالات میں ایک رات شدید سردی کا موسم، جالب صاحب ایک بزرگ کے مزار کے احاطے میں بہت بڑی رضائی میں گھس گئے کہ انہیں آواز آئی ''وے تینوں شرم نہیں آوندی (ارے تجھے شرم نہیں آتی) یہ آواز کسی ملنگنی کی تھی جو پہلے سے ہی رضائی میں لیٹی ہوئی تھی، جالب صاحب نے ملنگنی کی بات کا مختصر جواب دیا ''ہاں شرم آتی ہے'' اور رضائی سے نکل گئے۔ بس یونہی زندگی کے تجربات میں شب و روز گزرتے رہے۔ لائل پور میں بھائی فتح محمد کی ''شاہی مرغ پلاؤ'' کی بہت بڑی دکان تھی۔ بھائی فتح محمد صاحب کے بارے میں جالب صاحب لکھتے ہیں:

(7) ''فتح محمد کی لائل پور میں شاہی مرغ پلاؤ کی بڑی دکان تھی سب ہی انہیں فتح بھائی کہتے تھے یہ بھی لدھیانے کے رہنے والے تھے۔ شاعر احمد ریاض اور میرے بڑے اچھے دوست تھے، ساحر لدھیانوی سے بھی ان کا یارانہ رہا۔ ان کو غیبی علم تھا اور وہ اکثر بڑی عجیب و غریب باتیں کیا کرتے تھے۔ مارکسزم کے بارے میں بھی علم رکھتے تھے۔ یہ علم انہیں ساحر اور دوسرے لوگوں کے ساتھ نشستوں سے حاصل ہوا تھا۔ بھائی فتح محمد شاعروں ادیبوں کی بہت تواضع کیا کرتے تھے اور وہ سبھی کو

مفت پلاؤ کھلاتے تھے۔''

53-1952 میں جالب صاحب کا قیام لائل پور میں رہا۔اس دوران جن اصحاب کے ساتھ ان کے مہ وسال گزرے۔ جالب صاحب نے ان کے بارے میں اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے(8) چوہدری کرم الہی، غلہ منڈی میں ان کی رہائش تھی، جس کی چھت پر چارپائیاں اور بستر لگے ہوتے تھے۔میں اور احمد ریاض اکثر انہی چارپائیوں پر رات بسر کیا کرتے تھے اصغر لودھراں، بھی باذوق آدمی تھا۔م۔حسن لطیفی سے خوب ملاقاتیں رہتی تھیں۔لطیفی بہت ذہین انسان اور بہت اچھے شاعر تھے۔ان کا مشہور زمانہ شعر ہے۔

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا کہ تم نے فراموش کردیا

ان کے علاوہ حزیں لدھیانوی، شعیب حیدر اور روزنامہ ''غریب'' اخبار کے مالک خلیق قریشی بس انہی لوگوں کے ساتھ وقت گزارا اور پھر مجھے کوہ نور ملز میں مشاعرہ پڑھنے پر مل مالکان سعید سہگل، یوسف سہگل نے مل کی حدود میں رہنے کو ایک کمرے کا کوارٹر اور ملازمت دیدی۔مگر میرے مزاج نے مجھے وہاں ٹکنے نہ دیا۔مل میں ماہانہ مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔میں نے وہاں اپنی تازہ غزل پڑھی۔

شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی مشینوں میں

اور یہ شعر میں نے سامنے بیٹھے مالکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سنایا

پیار کی روشنی نہیں ملتی
ان مکانوں میں ان مکینوں میں

مل مالکان کے اعلیٰ مکانات بھی مل کی حدود ہی میں بنے ہوئے تھے۔لہٰذا نتیجتاً ہم اگلے روز پھر فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔ایک بار مسجد سے بھی نکالا گیا۔سردی کے دن تھے خانقاہ سے نکلا تو مسجد میں گھس گیا۔ وہاں مسجد کے مولوی نے مجھے کہا کہ ''یہ سونے کی جگہ نہیں ہے'' میں نے کہا ''یہ اللہ کی جگہ ہے تمہارے باپ کی جگہ نہیں، میں اللہ کا بندہ ہوں اور یہاں رات گزارنا چاہتا

ہوں، مجھے سردی لگ رہی ہے مگر مولویوں نے میری ایک نہ سنی اور میرے ہاتھ پاؤں پکڑ کر مسجد کے باہر پھینک دیا۔"

ایک یادگار مشاعرہ

(9) "لائل پور ہی کے زمانے میں ایک مشاعرہ پنجاب یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) کے ہال میں ہوا، جس سے میں لاہور میں پہلی بار متعارف ہوا۔ مجھے بس نہیں ملی تو میں ایک ٹرک والے کی منت سماجت کر کے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں مشاعرہ گاہ میں بہت دیر سے پہنچا، اس وقت مشاعرہ شباب پر تھا۔ شوکت تھانوی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ جب میں پنڈال میں داخل ہوا تو شور برپا تھا "زہرہ نگاہ، زہرہ نگاہ۔۔۔لوگ کسی اور کو سننا نہیں چاہتے تھے بس یہی شور تھا زہرہ نگاہ، زہرہ نگاہ، شوکت تھانوی کی نظر مجھ پر پڑی تو انہوں نے فوراً اعلان کر دیا۔ "اب میں لائل پور سے آئے ہوئے نوجوان شاعر حبیب جالب کو دعوتِ سخن دیتا ہوں" اب جب میں مائیک کے سامنے آ کر کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ لوگ مجھ سے بھی وہی سلوک کر رہے تھے جو دوسرے شاعروں کے ساتھ کر چکے تھے، مجھے شاعروں کی لاشیں نظر آ رہی تھی، مشاعرہ کیا تھا مقتل گاہ بنا ہوا تھا انہی لاشوں میں مجھے اپنی بھی لاش نظر آ رہی تھی۔ اب دو باتیں میرے ذہن میں تھیں کہ اگر نہ سنایا تو حسرت رہ جائے گی اور سناؤں تو شاید لوگ سن لیں۔ اس وقت مجھ پر ہوٹنگ ہو رہی تھی۔ شور برپا تھا "نکالو کہاں سے آ گیا یہ فقیر، پاگل، دیوانہ" کیونکہ میرے سر کے بال بھی بڑے بڑے تھے اور ایک میلی سی چادر میں نے اوڑھی ہوئی تھی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ انہیں حالات میں میں نے مطلع پڑھا۔

دل کی بات لبوں پر لا کر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

اب جو میں نے یہ مطلع پڑھا تو لوگوں نے کہا "ارے سنو بھئی یہ تو کوئی ٹھیک ٹھاک شاعر لگتا ہے" میں نے پھر مطلع پڑھا اور پھر دوسرا شعر۔

بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں

اور جب میں نے یہ شعر پڑھا کہ ۔

ایک ہمیں آوارہ کہنا، کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

جگر مراد آبادی مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے انہوں نے ''واہ واہ'' کہہ کر مجھے داد دی تو میں نے مائیک چھوڑ کے ان سے ہاتھ ملایا اور داد وصول کر کے دوبارہ مائیک پر آ کر وہ شعر پھر پڑھا اور یوں غزل کو آگے بڑھایا۔

جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا، جنکے لیے بدنام ہوئے
آج وہی ہم سے بیگانے، بیگانے سے رہتے ہیں
وہ جو ابھی اس راہ گزر سے چاک گریباں گزرا تھا
اس آوارہ دیوانے کو جالب جالب کہتے ہیں

یہ غزل مشاعرے میں ہٹ ہوگئی۔ اس کی بڑی پذیرائی ہوئی بہت شہرت ہوئی اور مجھے بہت عزت ملی لوگوں نے ایک اور۔۔۔ ایک اور۔۔۔ مکرر۔۔۔ مکرر۔۔۔ اب شوکت تھانوی مائیک پر آئے اور کہنے لگے ''دیکھیے ابھی فلاں غازی آبادی ہیں ابھی فلاں لکھنوی آئے ہوئے ہیں۔ انہیں پھر موقع دیا جائے گا'' تو میں نے سوچا کہ یہ شوکت تھانوی جو کام دکھا رہا ہے یہ مجھے پڑھانا نہیں چاہ رہا جبکہ لوگ مجھے سننا چاہتے ہیں۔ غصہ تو مجھے تھا ہی کہ کون صاحب ہیں وہ زہرہ نگاہ۔۔۔ لہٰذا میں فوراً مائیک پر آ گیا اور کہا ''حضرات آپ مجھے سننا چاہتے ہیں'' لوگوں نے کہا ''ہاں'' تو میں نے کہا کہ ''پھر یہ کون ہے بیچ میں، ہٹیے بیچ سے'' یہ کہ کر میں نے غزل سنانا شروع کر دی ۔

اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

دوسرے دن روزنامہ ''احسان'' میں اپنے زمانے کے معروف کالم نگار ظہور الحسن ڈار نے لکھا

''مشاعرے میں جگر، زہرہ نگاہ اور حبیب جالب کو سنا گیا۔'' زہرہ نگاہ بہت خوبصورت پڑھتی تھیں اور بڑے اچھے سادہ شعر کہتی تھیں، ان کی آواز میں بھی ایک خاص تہذیب تھی، ایک شدت تھی، ایک پاکیزگی تھی۔ ان کے بعد پڑھنا بڑا مشکل کام تھا۔ تو اس مشاعرے کے دوسرے دن میں لاہور میں زیر بحث رہا۔ اس طرح میں لاہور میں بھی متعارف ہو گیا''

راقم الحروف کی تاریخ پیدائش 10 جنوری 1947 ہے میں بھی اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ اپنے گاؤں میانی افغاناں میں پیدا ہوا۔ 1954 میں جب میری عمر سات برس تھی تو میں نے پہلی بار اپنے بھائی حبیب جالب کو گھر میں دیکھا۔ وہ کافی عرصے بعد گھر لوٹے تھے میں دیکھ رہا تھا میرے سامنے ایک شخص کھڑا تھا۔ کشادہ پیشانی بڑی بڑی روشن آنکھیں کاندھوں پر جھولتے گھنے سیاہ بال اس شخص نے سرمئی رنگ کی پتلون پر چیک دار کوٹ پہن رکھا تھا۔ اور قمیص کا گریبان کھلا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان اور اعتماد تھا۔ بے حد چمکدار تھا اس کا چہرہ۔ پہلی نظر میں ہی مجھے وہ بہت منفرد سا لگا۔

''اماں یہ کون ہے؟

میں نے اماں سے پوچھا

اس سے پہلے کہ اماں میرے سوال کا جواب دیتیں اس منفرد شخص نے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

اماں بولیں'' یہ بھی تمہارا بڑا بھائی ہے۔ حبیب

چار بھائیوں اور ایک بہن میں سب سے چھوٹا میں ہوں۔''

اس تعارف سے پہلے بھی وہ شخص مجھے بہت اپنا اپنا سا لگا تھا۔ بھائی کے رشتے سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر اپنا۔

حبیب نام سن کر میں نے حبیب بھائی کی گود میں بیٹھے بیٹھے ان کے چہرے کو پھر غور سے دیکھا، سرخ سفید رنگت، چمکدار چہرہ پر اعتماد روشن آنکھیں۔ اور پھر ان کا نام حبیب، یہ نام سن کر سات سال

کا بچہ سعید پختہ ہو گیا کہ ہونہ ہو میرا بھائی حبیب بہت دولت مند، امیر کبیر شخص ہے اور حبیب بنک کا مالک ہے۔ ایک عرصہ تک یہ تاثر میرے ساتھ ساتھ رہا کہ حبیب بنک میرے بھائی حبیب کا بنک ہے اور بعد کو جب میرا شعور بھی میرے ساتھ ساتھ بڑھا تو میں نے سمجھا میں نے جانا کہ ایسے تو کئی بنک میرے بھائی کی ٹھوکروں میں پڑے ہیں وہ تو اس سے بھی انمول ہے کہیں زیادہ مالدار ہے۔

1954 میں جالب بھائی معروف ہاری رہنما حیدر بخش جتوئی کی ہاری تحریک میں شامل ہو چکے تھے اور باقاعدہ عملی سیاست میں قدم رکھ چکے تھے۔ اسی تحریک کے کارکن کی حیثیت سے ان کی پہلی گرفتاری ریگل چوک صدر کراچی سے عمل میں آئی تھی۔

جب سندھ کے بڑے وڈیرے ایوب کھوڑو کے مقابلے میں حیدر بخش جتوئی الیکشن لڑ رہے تھے تو کراچی کے نوجوان ترقی پسند طالب علم بھی حیدر بخش جتوئی کی انتخابی کمپین میں حصہ لینے کے لیے سندھ جاتے تھے۔ جن میں عارف جلالی، حسن عابدی اور حبیب جالب کے ساتھ اور بھی نوجوان ہوتے تھے۔ جالب صاحب کہتے ہیں ''ایک بار کھوڑو صاحب نے ہم نوجوانوں کے قریب آ کر کہا کہ ''تم لڑکا لوگ یہاں کیا کرنے آتے ہو'' تو میں نے اس سے کہا ''ہم تمہاری بنیادیں اکھاڑنے یہاں آتے ہیں'' کھوڑو صاحب یہ سن کر چلے گئے وہ اسٹوڈنٹ ان کی بنیادیں کیا اکھاڑتے جس جھونپڑی نما گھر میں یہ نوجوان ٹھہرے ہوئے تھے اس کو ایوب کھوڑو نے آگ لگوا دی اور حیدر بخش جتوئی کی کار بھی جلا دی۔ حیدر بخش جتوئی کے انتخابی جلسوں میں حبیب جالب یہ نظم پڑھا کرتے تھے۔

حیدر بخش جتوئی اے بھیا حیدر بخش جتوئی
ہاری کا غم کھانے والا اور نہ دُوجا کوئی
رے بھیاؔ حیدر بخش جتوئی
ہم لاکھوں کی پونجی لوٹے جاگیردار اکیلا
اچھا پہنے، کار میں گھومے ٹھاٹھ کرے البیلا
ہم تو روئیں بھوک کے مارے اور اس کے گھر میلہ

آپ تو اوڑھے شال دوشالہ، ہمیں ملے نہ لوئی
رے بھیا حیدر بخش جتوئی، رے بھیا حیدر بخش جتوئی

اب جالب صاحب ملکی سطح پر ایک رومانی غزل گو شاعر کی حیثیت سے اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ 1952 میں جگر صاحب نے جالب صاحب کے بارے میں کہا ''اگر ہمارا زمانہ مہ نوشی ہوتا تو ہم پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر جالب کی غزل پر سرِ محفل رقص کرتے'' اب ان کی شہرت ہندوستان کے ادبی حلقوں تک بھی جا پہنچی تھی، سو وہ 1956 میں آل انڈو پاک مشاعرہ منعقدہ لال قلعہ دہلی میں مدعو کیے گئے۔ مشاعرے کے منتظم ''دلی کلاتھ ملز'' والے تھے۔ جالب صاحب نے اپنی مشہور غزل جو اپنے گاؤں کو چھوڑنے کے ہجر میں کہی تھی سنائی بٹوارے کا گھاؤ ابھی تازہ تازہ ہی تھا۔ غزل اور پھر جالب صاحب کا پرسوز ترنم، غزل نے خوب اپنا رنگ جمایا۔ غزل ملاحظہ ہو۔

محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
ترے شہر میں اک جہاں چھوڑ آئے
پہاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی
جہاں ہم دلِ نغمہ خواں چھوڑ آئے
وہ سبزہ، وہ دریا، وہ پیڑوں کے سائے
وہ گیتوں بھری بستیاں چھوڑ آئے
حسیں پنگھٹوں کا وہ چاندی سا پانی
وہ برکھا کی رت وہ سماں چھوڑ آئے
بہت مہرباں تھیں وہ گل پوش راہیں
مگر ہم انہیں مہرباں چھوڑ آئے
یہ اعجاز ہے حسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے
چلے آئے ان رہگزاروں سے جالب
مگر ہم وہاں قلب و جاں چھوڑ آئے

پنڈت جی نے جالب صاحب کی غزل کو پسند کیا اور یوں داد دی کہ اگلے روز انہیں ''پرائم منسٹر ہاؤس'' مدعو کرلیا۔

''اس مشاعرے کی نظامت خواجہ غلام سیدین کے سپرد تھی جو خواجہ الطاف حسین حالی کے نواسے تھے، اگلے روز پنڈت جواہر لعل نہرو کی دعوت پر پرائم منسٹر ہاؤس جانے والوں میں پاکستانی شعرا حفیظ جالندھری، شوکت تھانوی اور حبیب جالب تھے۔ ہندوستانی شعرا میں تلوک چند محروم کو مدعو کیا گیا تھا۔ جالب صاحب اپنی آپ بیتی 'جالب بیتی'' میں لکھتے ہیں (10) ''وہاں پرائم منسٹر ہاؤس میں ایک پینٹنگ لگی ہوئی تھی جو ہجرت سے متعلق تھی مہاجرین آ جا رہے تھے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر، میری غزل اس پینٹنگ کا اظہار تھی، جسے پنڈت جی نے بھی پسند کیا اور میں نے ان کی فرمائش پر دوبارہ غزل سنائی۔'''' محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے۔''

جالب صاحب آل انڈو پاک مشاعرہ پڑھ کر واپس آئے تو ہمارے والد صاحب کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا ان کے بیٹے حبیب جالب نے پنڈت جواہر لعل نہرو کی صدارت میں مشاعرہ پڑھ کر ہندوستان پاکستان کے معروف شعرا میں اپنا مقام بنالیا تھا۔ اور پھر ابا نے اپنے بیٹے کے بارے میں یاداشتیں سنجیدگی سے قلم بند کرنا شروع کردیں۔ حبیب جالب کی پیدائش ،تین سال کا حبیب جالب، سات سال کا حبیب جالب، پھر بارہ سال کی عمر میں جالب کی دہلی آمد اور مشاغل وغیرہ، یہ سب کچھ ابا نے اپنی قلمی یاداشتوں میں لکھا ہے۔ آج ابا کی ان تحریروں کو پڑھ کر مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی غیبی طاقت ان سے یہ کام کروا رہی تھی اور آج حبیب جالب کو سمجھنے کے لیے یہ تحریریں مضبوط حوالے کا درجہ رکھتی ہیں، ''جالب کے والد کی تحریری گواہی'' میں والد محترم کی تحریریں، اپنی کتاب ''حبیب جالب۔ گھر کی گواہی'' میں پیش کر چکا ہوں۔ مکتبہ دانیال کراچی سے 1994 میں شائع ہونے والی کتاب کے بارے میں حسن عابدی کہتے ہیں:

(11) ''جالب کے سلسلے میں یہ کتاب اب تک شائع ہونے والی تمام کتابوں سے کہیں زیادہ مستند، دلچسپ اور مفید ہے، جو نظر انداز نہیں کی جاسکتی بلکہ حوالے کے طور پر ہمیشہ یاد رکھی جائے

گی،" محمود شام کہتے ہیں" جناب سعید پرویز کی یہ کتاب تحقیق" مطالعہ کرنے والوں کے لیے سب سے پہلا اور مستند حوالہ ہوگی۔ کیونکہ یہ جالب کے اپنے گھر کی گواہی ہے"

حبیب جالب کی پیدائش

حبیب جالب صاحب کی پیدائش کے حوالے سے والد صاحب نے انگریزی سن یعنی 1928 لکھا ہے اور اسلامی تاریخ یکم شوال یعنی عیدالفطر کا دن، یہ دن عید کے حوالے سے انہیں پختہ یاد رہ گیا، بعد کو میں نے 1928 اور یکم شوال کے حوالے سے پرانی جنتری دیکھ کر اسلامی اور انگریزی تاریخیں نکالیں، ہندوستان (دہلی) کے نند کشور وکرم مدیر" عالمی اردو ادب" نے بھی میری نکالی گئی تاریخوں کی تصدیق کی ہے۔ جالب صاحب کی تاریخ پیدائش ملاحظہ فرمائیں 24 مارچ 1928 مطابق یکم شوال 1346 ہجری بروز ہفتہ بوقت صبح ساڑھے آٹھ بجے (وقت کا تعین والد محترم کی تحریر میں موجود ہے) اب جالب کے یوم پیدائش کا احوال والد صاحب کی زبانی سنیے:

(12) "حبیب احمد جالب کی تاریخ پیدائش تو میں نے لکھی نہیں ہے۔ تقریباً 1928 میں یہ بچہ پیدا ہوا ہے۔ وہ عیدالفطر کا دن تھا۔ یہ عید سعید کے دن پیدا ہونے والا بچہ جس کے کانوں نے نعرہ تکبیر اور نعرہ رسالتؐ کے فلک شگاف نعرے بلند ہوتے سنے، اس فضا میں اس بچے کی پیدائش ہوئی۔ ماہ صیام اپنی تمام تر رونقیں سمیٹ کر رخصت ہو چکا تھا۔ عید کا چاند نظر آنے کا اعلان ہمارے گاؤں کے ماسٹر محمد دین نے نقارے پر چوٹ لگا کر کر دیا تھا۔ روزے دار عید سعید کی خوشی میں سرشار نعرہ تکبیر، نعرہ رسالتؐ بلند کر رہے تھے، گولے چل رہے تھے کیونکہ صبح عید تھی۔ اہلِ اسلام عید کی خوشی میں اکثر چاند رات جاگ کر گزارتے ہیں۔

ایک چاند رات ہم نے بھی جاگ کر گزاری تھی۔ تمام رات میری زوجہ رابعہ بصری تکلیف میں مبتلا رہی حتیٰ کہ صبح کے چھ بج گئے۔ فجر کی نماز میں نے گھر پر ہی ادا کر لی

تھی۔میاں (میاں کرار خان) کے دیوان خانے سے بار بار نمازِ عید کے جلوس کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا۔ ماسٹر محمد دین اپنے کوٹھے کی چھت پر موجود نقارے کی چوٹ پر اعلان کر رہے تھے اور آہستہ آہستہ لوگ میاں کرار خان کے دیوان خانے کے باہر جمع ہو رہے تھے۔جلوس کی تیاریاں ہو رہی تھیں، میاں جی بار بار لوگوں سے میرے بارے میں پوچھ رہے تھے اور لوگ بھی بار بار گھر کے چکر لگا رہے تھے۔مگر میری مجبوری تھی، میں ایسی نازک حالت میں اہلیہ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا اور بالآخر نمازِ عید کا جلوس میاں کرار خان کے دیوان خانے سے روانہ ہو گیا۔ میں گھر کے صحن میں بیٹھا پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے کا منتظر تھا۔ رابعہ بصری کی نابینا ماں کچی کوٹھری میں اپنی بیٹی کے پاس موجود تسبیح کر رہی تھی۔ محلے کی دو ایک بزرگ عورتیں بھی اندر موجود تھیں، اسی اثنا میں کسی نے کوٹھری سے نکل کر مجھے مبارکباد دیتے ہوئے بتایا کہ بفضل تعالیٰ بیٹا پیدا ہوا ہے، اور زچہ بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔ یہ خبر سن کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور گھر سے نکل کر تیزی سے عید گاہ کی طرف بھاگا۔نماز عید کا جلوس پولیس چوکی تک پہنچ چکا تھا کہ جب میں نے جلوس کو جالیا۔ میرے جلوس میں شامل ہونے اور بیٹے کی پیدائش کی خبر سن کر تمام لوگ بہت خوش ہوئے میں نے نمازِ عید ادا کی اور بارگاہ ایزدی میں شکر ادا کیا۔ یہ وہ مبارک عید تھی کہ جب خدا کی رحمت سے میرے گھر شیر دل بیٹے حبیب احمد نے جنم لیا، جسے دنیا حبیب جالب کے نام سے جانتی ہے۔میری دعا ہے کہ خدا اس کی عمر دراز کرے (آمین)۔ یہ چاند رات کا چاند ہے جو مانندِ آفتاب دنیا میں طلوع ہوا۔کبھی نہ غروب ہونے کے لیے۔ یہ عید سبحان اللہ میں کبھی نہ بھولوں گا۔ کیا خوشی تھی کیا مسرت کا دن تھا۔ ماہ صیام کی برکتوں سے لبریز ایک سہانی صبح عید تھی کہ جب حبیب جالب پیدا ہوا، یہ نوید صبح بن کر دنیا میں آنے والا، یہ روشنیوں کا دلدادہ یہ اجالوں کا متوالا، یہ اندھیروں کا دشمن، تاریکیوں

سے منتظر، اس کی پیدائش صبح ساڑھے آٹھ بجے ہوئی کہ جب رات کی سیاہیوں کا سینہ چیرتے ہوئے انوار و تجلیات کا سورج آب و تاب سے چمک رہا تھا۔"

حبیب جالب کی تاریخ پیدائش سے ایک اور تاریخی واقعہ بھی جڑا ہوا ہے میں نے اپنے کالم میں اس کا ذکر کیا ہے:

(13) "مارچ جالب کا مہینہ ہے 24 مارچ جالب کا یومِ پیدائش ہے اور یہی 24 مارچ عظیم حریت پسند جنگ آزادی کے ہیرو بھگت سنگھ کو پھانسی دینے کے لیے انگریز سرکار نے مقرر کی تھی۔ لاہور کی بوسٹل جیل میں (جہاں آج کل شادمان کے نام سے معروف پوش آبادی موجود ہے) پھانسی دینا تھی، مگر شہر کے حالات شدید خراب ہونے کے پیش نظر بھگت سنگھ کو اس کے ساتھیوں سمیت ایک دن پہلے 23 مارچ کی رات کے آخری پہر میں پھانسی دیدی گئی کچھ ہی دیر بعد 24 مارچ کا سورج طلوع ہوا۔ بھگت سنگھ انگریز کے خلاف لڑتا ہوا تختہ دار تک جا پہنچا اور حبیب جالب کی تمام زندگی انگریزوں کے ایجنٹوں کے خلاف لڑتے ہوئے گزری۔ بھگت سنگھ اور جالب کی تاریخ ایک ہے۔ لیکن سن میں فرق ہے۔ جالب 24 مارچ 1928 کو پیدا ہوئے جبکہ بھگت سنگھ کو 24 مارچ 1931 کو پھانسی دی گئی۔ رضی اختر شوق کا شعر ہے۔

ہم روحِ سفر ہیں، ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ

ہم خاص گاؤں کے لوگ ہیں، خصوصاً ہمارے والدین کی بود و باش خالص دیہاتی تھی۔ لہٰذا رہن سہن اور زندگی گزارنے کے رنگ ڈھنگ، گاؤں دیہات کا رچاؤ لیے ہوئے تھے۔ ابا اپنے بیٹے حبیب کے بارے میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب حبیب محض تین سال کا تھا:

(14) "ایک دفعہ کا ذکر ہے میرا چھوٹا بیٹا حبیب اس وقت تین سال کا تھا،

گرمیوں کا موسم تھا اور اچانک شام میں اسے بخار ہوا اور رات ہوتے ہوتے بخار کی شدت میں اضافہ ہو گیا جوں جوں رات گزر رہی تھی بخار کا زور ٹوٹنے کی بجائے اس کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ حبیب مجھ سے بہت مانوس تھا، اس لیے میں نے اسے اپنی گود میں لے رکھا تھا، میں دیکھ رہا تھا کہ بخار کی شدت کے باعث حبیب بار بار چیخ مار کر میری بغل میں گھس جاتا تھا، یوں جیسے وہ کسی سے خوفزدہ ہو۔ گرمی کی وجہ سے ہم دونوں میاں بیوی بچے کو لیکر کھلی چھت پر آ گئے، ہمارا خیال تھا کہ کھلی فضا میں بچے کو کچھ سکون ملے گا مگر بچے کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں آ رہا تھا اور بخار کی شدت میں بھی کوئی کمی نہیں آ رہی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر حبیب کو دم درود کر رہے تھے اور اسی تگ ودو میں آدھی رات بیت گئی۔ بچہ ہنوز بخار میں تپ رہا تھا میں گود میں بچے کو لیے بیٹھا تھا کہ حبیب کی ماں نے مجھے بتایا کہ شام مغرب کے وقت حبیب گھر کے دروازے پر کھڑا تھا اور مجھے بابا میرِ شاہ صاحب کی آواز سنائی دی تھی وہ کہہ رہے تھے ''شام کے وقت بچے کو دروازے پر مت کھڑے ہونے دیا کرو، بچے کو اندر کر لو'' حبیب کی ماں نے مجھے یہ واقعہ سنانے کے بعد کہا ''سنا ہے بابا میرِ شاہ صاحب گولے آرائیں کے گھر تشریف لائے ہوئے ہیں کیوں نہ ہم حبیب کو لے کر بابا جی کی خدمت میں حاضر ہو جائیں تاکہ وہ بچے کو دم کر دیں'' حبیب کی ماں کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ آدھی رات گزر چکی تھی باہر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گاؤں اور دیہات کی اندھیری رات کہ جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا ایسے میں دوسرے محلے جانے کے خیال سے ہی بدن میں جھرجھری سی آ گئی۔ مگر بچے کی تکلیف بھی ناقابل برداشت تھی۔ لہٰذا ہم میاں بیوی خدا کا نام لیکر گھر سے بابا جی کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے حبیب کو اٹھا رکھا تھا اور گاؤں کی خاموش سنسان اور اندھیری رات میں ہم دونوں میاں بیوی بچے کو لیے چلے

جا رہے تھے، حتیٰ کہ گولے آرائیں کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اتنی رات گئے دروازے پر دستک سن کر گولے آرائیں کے گھر والے پریشان ہو گئے۔ بابا میرِ شاہ صاحب بھی نیند سے بیدا ہو گئے تھے۔ ہم نے بابا جی سے بچے کی کیفیت بیان کی انہوں نے بچے کو دم کیا اور مجھے بھی چاروں قل اور اول آخر درود شریف پڑھنے کا کہا۔

بابا میرِ شاہ کی خدمت میں حاضری دے کر ہم بچے کو لیکر گھر آ گئے میں بابا جی کی بتائی ہوئی قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر بچے کو دم کرتا رہا۔ مگر بچے کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ بچہ بدستور بخار میں تپ رہا تھا اور بار بار چیخ مار کے میری بغل میں گھس جاتا تھا۔ بچہ بار بار اپنا ہاتھ بھی منہ میں ڈال رہا تھا۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ میں مسلسل بچے کو آیاتِ قرآنی پڑھ پڑھ کر دم کر رہا تھا۔ پھونکیں مار رہا تھا اور پھر اچانک اسی حالت میں مجھے نیند نے آ گھیرا۔ میں نیم غنودگی کی حالت میں تھا کہ مجھے ایک بہت ہی خوفناک آواز سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا ''تم بڑی تحصیل میں پہنچ گئے ورنہ ہم بچے کو لے جاتے'' یہ آواز اور الفاظ سن کر میرا کلیجہ ہل گیا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے حبیب کو دیکھا بخار ویسا ہی تھا۔ مگر اب مجھے عین تسلی ہو گئی تھی کہ میرا بچہ ٹھیک ہو جائے گا اور پھر صبح ہوتے ہوتے واقعی بچے کا بخار بہت ہلکا ہو گیا۔ صبح اللہ کے ایک اور نیک بندے، بزرگ ''سائیں لانڑے شاہ'' ہمارے گھر تشریف لے آئے۔ حبیب کو بیمار دیکھ کر انہوں نے بھی بچے کو دم درود کیا اور صحت کے لیے دعا کی۔ دعا کے بعد سائیں جی نے بابا میر شاہ کے بارے میں پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ بابا جی ''محلّہ بنگہ'' میں گولے آرائیں کے گھر تشریف لائے ہوئے ہیں، مگر پھر پتہ چلا کہ بابا میرِ شاہ صاحب جالندھر تشریف لے جا چکے ہیں۔ ''سائیں لانڑے شاہ'' صاحب ہمارے گھر پر ہی موجود تھے، بچے کی حالت کے

پیش نظر سائیں جی کی موجودگی ہمارے لیے بہت ہی حوصلہ وتسلی کا باعث تھی۔
سائیں جی ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے اچانک انہوں نے مجھ سے کہا ''بھئی حضرت سخی سرور سلطانؒ کا عرس شریف شروع ہوگیا ہے چلو ہم دونوں عرس میں شرکت کے لیے کپورتھلہ چلیں'' سائیں جی کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ بچہ ابھی مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو پایا تھا، ایسی حالت میں بچے کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا، جبکہ بچہ مجھ سے بے حد مانوس ہونے کی وجہ سے میرے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر دوسری طرف سائیں جی کا کہنا میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا اور پھر حضرت سخی سرور سلطانؒ کا عرس شریف، آخر میں نے سائیں لانڑے شاہ کے حکم پر عرس شریف میں شریک ہونے کا فیصلہ کرلیا، اور اللہ کا نام لیکر سائیں جی کے ساتھ اپنے گاؤں میانی افغاناں سے کپورتھلہ روانہ ہوگیا، مگر راستے بھر ایک لمحے کے لیے بھی میرا دھیان حبیب کی طرف سے نہ ہٹ سکا۔ کپور تھلے پہنچ کر حضرت سخی سرور سلطانؒ کی درگاہ کے گدی نشین سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان کی خدمت میں اپنے بچے حبیب کی صحت یابی کے لیے دعا کرنے کی التجا کی، جواباً انہوں نے حبیب کے لیے بطور خاص دعا فرمائی اور پھر بچے کا احوال سن کر فرمایا کہ ''بچہ جب سات سال کا ہو جائے تو اسے کپورتھلہ عرس شریف میں نیاز کے ساتھ حاضری کے لیے ساتھ لانا'' اور پھر نیاز کے بارے میں بتایا کہ ''حسب توفیق نقارہ بنایا جائے جسے بچہ خود بجاتا ہوا حضرت سخی سرور سلطانؒ کی نیاز لے کر حاضری دے انشاء اللہ بچہ صحت تندرستی کے ساتھ عمر دراز پائے گا۔''
میلہ حضرت سخی سرور سلطانؒ کا آج پہلا دن تھا۔ میلہ آٹھ یوم تک جاری رہنا تھا۔ سائیں لانڑے شاہ محمد سے بولے ''اب بچے کی طرف سے اطمینان ہوگیا ہے لہٰذا عرس کے اختتام تک درگاہ پر قیام کریں گے''، مگر میں اپنے لختِ جگر کے لیے بے چین تھا، جسے میں

بیمار چھوڑ آیا تھا۔ ان حالات میں میرے رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا میں نے بڑے ادب کے ساتھ روانگی کی اجازت چاہی۔ سائیں جی نے ہر چند مجھے روکنا چاہا مگر میں نہ رک سکا۔ سائیں جی آخر بولے ''دیکھو عنایت تم آج اپنے گاؤں نہیں پہنچ سکو گے''۔ مگر اس کے باوجود بھی میں اللہ کا نام لے کر کپور تھلہ سے جالندھر ہوتا ہوا رات کے نو بجے ''ٹانڈہ'' کے ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔

''ٹانڈہ'' تو میں پہنچ گیا اس وقت رات کے نو بج رہے تھے اور مجھے سائیں لانڑے شاہ کا خیال آ رہا تھا اور ان کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے ''دیکھو عنایت تم آج اپنے گاؤں نہیں پہنچ سکو گے''۔ میں ٹانڈہ کے ریلوے اسٹیشن پر کھڑا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ٹانڈہ سے میانی چار پانچ میل کا سفر اس اندھیری رات میں اکیلا کیسے طے کر سکوں گا نہ کوئی ساتھی نہ سواری، مگر ان تمام مجبوریوں کے باوجود اپنے بیمار لختِ جگر کی خاطر مجھے گاؤں پہنچنا تھا۔ اور پھر یہ سوچ کر، خطرناک راستے کی پرواہ کیے بغیر اندھیری رات میں پیدل ہی سڑک سوار ہو گیا۔

''ٹانڈہ'' سے ''انے دی کھوئی'' (اندھے کا کنواں) تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھی، جب میں اس جگہ کے قریب پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ ادھر سے میں اور میری مخالف سمت سے کوئی اور مسافر آ رہا ہے۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ کوئی بھی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ادھر سے اور وہ ادھر سے اپنی اپنی دھن میں مگن چلے آ رہے تھے کہ دونوں زوردار طریقے سے آپس میں ٹکرا گئے اور پھر وہ مجھ سے اور میں اس سے خوفزدہ ہو کر اپنی اپنی سمت میں بھاگے۔ بھاگتے بھاگتے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا ہاں البتہ کوئی بھاگا چلا جا رہا تھا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کون تھا۔

اس وقت میری عجیب حالت تھی۔ خوف کے مارے میرا برا حال تھا۔ میں نے ''نادِ علی'' کا ورد شروع کر دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا گاؤں کی طرف چلتا رہا، اپنے بیمار بیٹے کا خیال بھی مجھے آ رہا تھا۔

اسی تانے بانے میں ''پکایل'' آ گیا، اور پھر کسی طرح میں سائیں قائم شاہ کی ''کھوئی'' (کنواں) پر پہنچ گیا۔ وہ رات میں کبھی نہ بھول پاؤں گا کہ جب اپنے بیمار بیٹے حبیب کی محبت میں، میں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ رات میں ''ٹانڈے سے میانی'' کا سفر بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ راستے میں چور ڈاکوؤں کا بھی خطرہ رہتا تھا۔ مگر یہ سب بزرگان دین کا فیض تھا کہ میں اس رات بحفاظت اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ اب سلوتر خانے کی عمارت تک میں پہنچ چکا تھا اور پھر فوراً ہی ایک گلی مڑ کر میں بخیریت تمام گھر پہنچ گیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے اور گنگو چوکیدار کی آواز آ رہی تھی۔ ''جاگتے رہنا بھئی اوئے'' میں گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ حبیب کو اس کی ماں گود میں لیے بیٹھی تھی اور پاس ہی حبیب کی نابینا نانی تسبیح لیے بیٹھی تھی اور پڑھ پڑھ کر بچے کو دم کر رہی تھی میں نے حبیب کے ماتھے پر ہتھیلی رکھی اسے بخار تھا۔ ''اچھا ہوا تم آ گئے! بچے نے ابا جی ابا جی کی رٹ لگا رکھی تھی'' حبیب کی نابینا نانی نے مجھ سے کہا۔ حبیب مجھے دیکھ کر اپنی ماں کی گود سے اتر کر میری گود میں آ گیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

''اتنی رات گئے کیسے پہنچے ہو؟'' حبیب کی ماں نے مجھ سے پوچھا۔ تب میں نے سفر کا تمام حال بیان کیا کہ کس طرح ''ٹانڈے سے میانی'' پانچ میل کا فاصلہ میں نے طے کیا۔ میرے بحفاظت پہنچنے پر حبیب کی نانی اور ماں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ پھر میں نے حضرت سخی سرور سلطانؒ کی درگاہ کے سجادہ نشین کی حبیب کے لیے دعائے خیر اور سات سال کی عمر میں حبیب کی درگاہ پر حاضری کے بارے میں بتایا۔ خدا کے نیک بندوں کی برکت اور دعا سے میرا بچہ حبیب جلد ہی صحت یاب ہو گیا۔ اور پھر سات سال کی عمر کو پہنچنے پر درگاہ حضرت سخی سرور سلطانؒ کے سجادہ نشین صاحب کے حکم کے مطابق حسب توفیق نقارہ بنوایا گیا، جسے گلے میں ڈال کر بجاتے ہوئے سات سالہ حبیب نے درگاہ حضرت سخی سرور سلطانؒ کپور تھلہ حاضری دی۔''

اس واقعے پر معروف نقاد ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں:

''اور پھر ساری زندگی جالب حق وصداقت کا نقارہ بجاتے رہے۔''

اسی طرح بزرگوں کا ایک اور واقعہ بھی ہے:

''گاؤں ''ٹانڈہ اڑمڑ'' میں درگاہ حضرت افضل جیؒ کے خدمت گار حضرت بابا دولے شاہ صاحب نے عالم جذب میں جالب صاحب کے بارے میں ایک پیشن گوئی کی تھی۔ مختصر واقعہ یوں ہے کہ حضرت بابا دولے شاہؒ صاحب ہمارے والد صاحب کے ہم عمر تھے اور درگاہ حضرت افضل جی پر جھاڑو کشی کیا کرتے تھے۔ درگاہ کے احاطے میں ہمارے والد اور دادا جی کے درمیان تکرار ہو رہی تھی۔ دادا جی، ابا جی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہیے تھے اور ابا جی مسلسل انکار کر رہے تھے کیونکہ وہ پریشان تھے کہ اگلے روز ان کے بڑے بیٹے مشتاق کا میٹرک کا نتیجہ آ رہا تھا۔ باپ بیٹے کی تکرار بابا دولے شاہ صاحب بھی سن رہے تھے اور آخر وہ بیچ میں بول پڑے اور اپنے دوست یعنی ہمارے ابا سے بولے ''اوئے عنایت! کیوں بار بار اپنے باپ کو انکار کر رہا ہے۔ باپ کی بات مان اور ان کے ساتھ جا'' ابا کو بابا صاحب کی مداخلت بہت بری لگی اور وہ بابا صاحب سے درشت لہجے میں بولے ''تو کیا بیچ میں بول رہا ہے چل اپنا کام کر اور جھاڑو لگا'' بابا جی جیسا کہ میں نے بتایا کہ ابا کے ہم عمر تھے اور ان میں دوستی بھی تھی مگر بابا جی نے اپنے دوست عنایت کی بات کو دل پر لے لیا اور وہ غصے میں آگ بگولا ہو گئے اور بولے ''اوئے عنایت! تو نے ہمیں کہا کہ جا جھاڑو لگا اور یہ کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں ہے! تو سن ''کل تیرے بیٹے کا میٹرک کا نتیجہ آ رہا ہے اور ہم نے اسے پاس بھی کر دیا۔ ہم نے درخواست اس درگاہ میں پیش کر دی ہے جو بارگاہ الٰہی میں منظور بھی ہو گئی ہے'' ابا سر جھکائے بیٹھے تھے اور بابا جی کی کیفیت سے بے خبر تھے انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ بابا جی کا غیض و غضب اور بڑھ گیا اور وہ ابا سے بولے ''سن عنایت! قسم خدا کی، ہم یونہی ''کتے رنگو فقیر نہیں

ہوئے'' رب دی سوں'' اگر تیرا بیٹا پاس نہ ہوا تو اس روضے کو اینٹ اینٹ کر دوں گا'' یہ الفاظ سن کر ابا نے باباجی کی طرف دیکھا تو وہاں تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ باباجی کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں ان کا پورا جسم جذب کے عالم میں کانپ رہا تھا۔ ایسے میں جالب صاحب کے اسکول ٹیچر احمد حسین وہاں تشریف لائے۔ اور انہوں نے جو دیکھا کہ درویش خاص کیفیت میں موتیوں کے دان لٹا رہا ہے دریائے سخاوت زوروں پر ہے تو انہوں نے باباجی سے کہا'' حضور کچھ ہمارے شاگرد حبیب کے لیے بھی عطا فرما دیں، تو بابا دولے شاہ صاحب اسی جذب کے عالم میں بولے'' اس کی تو خوشبوئیں دور دور تک ہونگی اور یہ یکتا ہوگا۔''

یہ واقعہ 1939 کا ہے۔ جسے والد صاحب نے اپنی قلمی تحریروں میں لکھا ہے۔ تحریر کے آخر میں والد صاحب لکھتے ہیں:

'' بابا دولے شاہ صاحبؒ کی دعائیں آج میں عملی شکل میں دیکھ رہا ہوں میرا بڑا بیٹا مشتاق حسین مبارک محض میٹرک پاس تھا اور آج باباجی کی دعا کہ'' ہم نے اس کے بڑے بڑے مرتبے بھی کر دیئے'' کے عین مطابق مشتاق ترقی کرتا ہوا کلاس ون گزٹیڈ آفیسر بن گیا ہے۔ انگریزی، فارسی، اردو، عربی پر اسے دسترس حاصل ہے، ملک بھر کے اہل علم و دانش اسے پہنچانتے ہیں کہ وہ خود بھی اردو کا ممتاز شاعر ہے جبکہ میرا دوسرا بیٹا حبیب، جس کے بارے میں بابا دولے شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ '' اس کی خوشبو دور دور تک پھیلے گی اور یہ یکتا ہوگا۔ باباجی کی یہ دعا بھی اللہ تعالیٰ نے پوری فرمائی اور ایسا ہی ہوا کہ میرے بیٹے حبیب جالب کی خوشبو اس کی شاعری کی صورت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور وہ اپنے عمل میں یکتا ہے۔''

لوک گیتوں اور داستانوں کے اسی خطے'' میانی افغاناں'' کے بارے میں شاعر کیا کہتا ہے وہ بھی سنیے حبیب جالب کی شاعری میں جابجا اپنے گاؤں کا ذکر ملتا ہے۔ آخر آخر بھی وہ اپنے گاؤں کو

نہیں بھلا پائے تھے۔ ہجرت (تقسیم ہند) کے بھی ان پر گہرے اثرات تھے اور پھر جب نئے وطن میں خواب چکنا چور ہوئے۔ تو یہ کرب ناسور بن گیا۔ اس تمام صورت حال کا ملال جالب ہی سے سنیے۔ ''داستان دل دو نیم'' کے عنوان سے وہ اسے برنگ مثنوی طویل لکھنا چاہتے تھے۔ مگر بوجوہ ایسا نہ کر پائے۔ بہر حال جتنا بھی انہوں نے لکھا۔ ملاحظہ فرمائیں:

داستان دل دو نیم

اک حسیں گاؤں تھا کنارِ آب
کتنا شاداب تھا دیارِ آب
کیا عجب بے نیاز بستی تھی
مفلسی میں بھی ایک مستی تھی
کتنے دلدار تھے ہمارے دوست
وہ بچارے، وہ بے سہارے دوست
اپنا اک دائرہ تھا دھرتی تھی
زندگی چین سے گزرتی تھی
قصہ جب یوسف و زلیخا کا
بیٹھے بیٹھے سروں میں چھڑتا تھا
قصر شاہوں کے ہلنے لگتے تھے
چاک سینوں کے سلنے لگتے تھے
گیت سنتے تھے گیت گاتے تھے
ڈوب کر سر میں دن بتاتے تھے
یوں بھڑک اٹھی نفرتوں کی آگ
زندگی میں رہے نہ رنگ نہ راگ
دیکھنے کیا لگے سہانے خواب
ہوگئے اپنے آشیانے خواب

یہ بجا زیست پاپیادہ تھی
دھوپ سے چھاؤں تو زیادہ تھی
شاخ سے ٹوٹ کر ہوا کے ہوئے
دربدر اُس گلی سے آ کے ہوئے
اجنبی لوگ اجنبی راہیں
لب پہ آباد ہوگئیں آہیں

بقیہ مثنوی خاصی تلخ ہے اور میں ابھی کہانی میں تلخی نہیں گھولنا چاہتا۔ ابھی ہم جالب کے حسین پنگھٹوں، پہاڑوں کی سرسبز و شاداب وادی، گھنے پیڑوں کے سائے اور محبت کی رنگینیاں لیے گاؤں کی بہت مہربان راہوں تک ہی محدود رہیں گے۔ جالب کا ایک شعر دہرانا چاہتا ہوں۔ اس بات کے ساتھ کہ اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ جالب کے صرف ایک شعر کو منتخب کروں تو میں انتخاب کروں گا۔

بہت مہرباں تھیں وہ گل پوش راہیں
مگر ہم انہیں مہرباں چھوڑ آئے

چلیے جالب کے گاؤں میں جالب ہی کے ساتھ چلتے ہیں:

(16) ''جب میرے شعور نے ذرا آنکھ کھولی تو میں ایک کچے گھر میں تھا۔ میرے اردگرد غربت اور افلاس کی فضا تھی۔ وہ کچا مکان جو بارشوں میں اکثر ٹپکتا تھا۔ میری والدہ اس کی لیپا پوتی میں لگی رہتی تھیں۔ وہ مکان میری نانی کا تھا جو انہوں نے ہمیں دے رکھا تھا۔ میرے دادا میرے والد، والدہ سے ناراض تھے یا کیا وجہ تھی؟ کہ وہ انہیں اپنے ساتھ نہیں رکھتے تھے اسی باعث ہماری نانی نے یہ مکان دے رکھا تھا۔ میرے والد جفت ساز تھے۔ پنجابی جوتی (کھسہ) پر طلع کاری کے بڑے ماہر تھے، ان کی بنائی ہوئی جوتی شادی بیاہ پر دولہا دلہن پہنتے تھے چونکہ یہ جوتی بڑی مہنگی ہوتی تھی۔ اس لیے یہ کام اتنا زیادہ نہیں چلتا تھا۔

جب میں پہلی جماعت میں داخل ہوا، تو اس وقت میری عمر چھ یا سات برس ہوگی۔ ہمارے دوست بھی بس مفلس لوگوں کے بچے ہوتے تھے کیونکہ خاں صاحبوں کے بچوں کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ میں نے جس غریب گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں تو مسائل ہی مسائل تھے۔ مجھے یاد ہے جنگل میں لکڑیاں چننے جاتے تھے، مکئی کٹ جانے کے بعد کھیتوں میں ہل چلتا تھا تو مکئی کی جڑیں (منڈھ) رہ جاتی تھیں۔ انہیں ایک جگہ اکٹھا کر لیا جاتا تھا اور پھر وہ جلانے کے کام آتی تھیں۔ ہر سال ایک جوڑا کپڑوں کا ملتا تھا اور بطور عیدی ایک آنہ، عید پر ملنے والے جوڑے ہی میں پورا سال گزار دیتے۔ غرض کہ غربت کی انتہا تھی۔ گاؤں دیہات میں ویسے بھی لوگوں کے پاس پیسے نہیں ہوتے۔ معاملاتِ زندگی یونہی چلتے کہ جوتا بن گیا تو کچھ اناج مل گیا۔ بس یونہی زندگی کے دن رات گزرتے۔ میرے نانا پڑھے لکھے آدمی تھے، اس زمانے میں کہانیاں سننے سنانے کا بڑا رواج تھا۔ میری نانی بھی رات کو کہانی سنایا کرتی تھی۔ اور انہیں کچھ ایسا طریقہ بھی آتا تھا کہ وہ کہانی گھڑ لیا کرتی تھیں اور کہانی سنانے سے پہلے تمہید باندھا کرتی تھیں جیسے ''ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ یا'' سننے والے کی عمر دراز ہو سنانے والے کا بھی بھلا'' اور مجھے خوب یاد ہے کہ جب میرے بڑے بھائی مشتاق کو میٹرک پاس کرنے کے بعد دلی میں سرکاری ملازمت مل گئی۔ تو والد، والدہ بھائی کے ساتھ دلی منتقل ہو گئے، (1939 کا واقعہ ہے اس وقت میں درجہ چہارم میں پڑھ رہا تھا) تو میں پیچھے گاؤں میں نابینا نانی کے پاس رہ گیا۔ میری نانی جب بینا تھیں تو وہ ازار بند جرابیں وغیرہ بن لیا کرتی تھیں اور بینائی جانے کے بعد بھی انہیں یہ مہارت حاصل رہی اور پھر یہ ہنر آمدنی کا ایک ذریعہ بھی بن گیا۔ ہوتا یوں کہ جب میں اسکول سے پڑھ کر گھر آتا تو میری نانی ازار بند، چٹلے جرابیں وغیرہ لیکر میرے ساتھ نکل جاتیں میرے کندھے

پر ان کا ہاتھ ہوتا اور ہم نانی نواسہ قریب کے گاؤں گلی گلی گھوم پھر کر یہ چیزیں بیچا کرتے تھے۔ کچھ لوگ نابینا نانی کو دیکھ کر ازارہِ ترحم چیزیں خرید لیتے تھے یوں آٹھ دس آنے اکٹھے ہو جاتے اور ہمارے تین چار دن کا انتظام ہو جاتا۔ نانی آٹا گوندھا کرتی اور روٹی ہانڈی بھی پکا لیا کرتی تھیں۔ جب ہم شام کو چٹلے، ازار بند، جرابیں بیچ کر گھر واپس آتے تو جو روکھا سوکھا ہوتا کھاتے، اور رات کو سونے سے پہلے نانی کہانی سنانے کے انداز میں مجھ سے کہتیں ''ہاں بھئی حبیب آج کتنے کی بکری ہوئی'' میں کہتا ''نانی مجھے کیا پتہ'' پھر وہ خود ہی بتاتیں ''آج دس آنے کی بکری ہوئی'' اور پھر وہ مجھ سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھتی ''تو کل کیا پکائیں؟ اچھا ایسا کرتے ہیں مچھلی پکا لیتے ہیں'' میں کہتا ''ہاں ٹھیک ہے'' پھر خود ہی کہتی ''نہیں نہیں مرغ بھون لیتے ہیں'' میرے منہ میں پانی بھر آتا اور میں خوش ہو کر کہتا ''ہاں نانی ٹھیک ہے'' پھر نانی کہتی ''نہیں نہیں پلاؤ بناتے ہیں حتیٰ کہ نانی، گوشت، سری پائے سارے ہی کھالوں کا ذکر کر ڈالتیں اور میں رات بھر ان کھانوں کی خوشبو اور تصور میں خواب ہی خواب دیکھتا'' حتیٰ کہ صبح ہو جاتی، میں اسکول چلا جاتا اور دوپہر کو اسکول سے جلدی جلدی گھر آتا کہ نانی نے بہت اچھا کھانا پکا رکھا ہوگا۔

گھر پہنچے پر میں نانی سے کہتا ''نانی بڑی بھوک لگی ہے جلدی سے کھانا دے دو'' تو نانی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتیں، ''وہ میں آج بڑی مصروف رہی، پڑوسن آ گئی تھی، میں ادھر چلی گئی تھی اور یوں میرے سارے سہانے خواب ملیامیٹ ہو جاتے اور نانی کہتیں ''چلو بیٹا ''چڑی میوہ'' بنا لیتے ہیں اسی سے روٹی کھالیں گے۔ چڑی میوہ کا سالن یوں تیار ہوتا ''کٹورے میں سادہ پانی لے کر ثابت سرخ مرچیں مسل کر اس پانی میں شامل کر دیں اور پھر نمک کا ڈھیلا حسبِ ذائقہ گھما لیا۔ لوجی ''چڑی میوہ'' تیار۔

ہمارے گاؤں کے ساتھ ہی گاؤں ''عالم پور'' تھا مولوی غلام رسول عالم پوری، اسی

گاؤں کے رہنے والے تھے۔ جن کی پنجابی شاعری کی کتاب ''یوسف زلیخا'' پنجابی ادب میں اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ''چٹھیاں'' بھی بڑا درجہ رکھتی ہیں۔ مولانا غلام رسول عالم پوری کے شاگرد عیسیٰ مہر ہمارے گاؤں میں رہتے تھے۔ عیسیٰ مہر صاحب سے میں نے قرآن شریف پڑھا اور کچھ سپارے حفظ بھی کیے۔ میرے استاد عیسیٰ مہر اپنے استاد کے بارے میں بتایا کرتے تھے کہ مولوی غلام رسول عالم پوری ''برنے'' کے درخت کے نیچے آ کر بیٹھ جاتے لوگ ان کے آس پاس بیٹھ جاتے اور وہ ترنم میں ''قصہ یوسف زلیخا'' لوگوں کو سنایا کرتے تھے اور اشعار لکھتے ہوئے بھی ترنم کا استعمال کرتے تھے۔ عیسیٰ مہر صاحب مجھے اپنے استاد کے ترنم میں یوسف زلیخا سنایا بھی کرتے تھے۔ انہی کے پاس میں نے ادب سے متعلق بہت سی کتب دیکھیں۔ جو پڑھ سکا پڑھیں۔''

پانچویں جماعت پڑھ کر جالب صاحب کو والدین نے دہلی بلوالیا۔ جہاں والدین اپنے بڑے بیٹے مشتاق، حمید اور اکلوتی بیٹی رشیدہ بیگم کے ساتھ موجود تھے۔ دہلی میں جالب صاحب کو اینگلو عربک اسکول اجمیری گیٹ میں درجہ ششم میں داخل کروادیا گیا۔

ہمارے والد لکھتے ہیں:

(17) ''حبیب خوش قسمت ہے کہ اپنے حسین گاؤں کے بعد اسے دہلی جیسا شہر نصیب ہوا اور اچھے اساتذہ ملے، اینگلو عربک اسکول اجمیری گیٹ میں حبیب کے استاد جناب احمد حسنی صاحب تھے جو خواجہ حسن نظامی دہلوی کے بھتیجے تھے اور اسکول میں اردو، فارسی، عربی پڑھاتے تھے۔ جناب احمد حسنی صاحب آج کل لاہور یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے منسلک ہیں اور مسجد نور، سنت نگر لاہور میں خطیب ہیں اور رضا کارانہ درس قرآن وحدیث بھی دیتے ہیں۔ دہلی میں ہمارا پہلا قیام چونا منڈی کے علاقے میں ہوا۔ جہاں ہم سال ڈیڑھ سال تک رہے۔ اس کے بعد ہم پچکویاں

روڈ پر بنے ہوئے سرکاری کوارٹروں میں آ گئے۔ اس جگہ جامن کے بہت زیادہ درخت لگے ہوئے تھے۔ قریب ہی حضرت باقی باللہؒ کا مزار تھا۔ حضرت باقی باللہؒ بہت جلالی بزرگ گزرے ہیں اوران کے جلالی مزاج کی طرح ان کے مزار مبارک پر بھی ہیبت وجلال کا سماں ہمہ وقت رہتا تھااوران کے مزار پر دن کے وقت بھی لوگ جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ مگر میرا بیٹا حبیب دن ہو یا رات جب طبیعت چاہتی حضرت باقی باللہؒ کے مزار پر چلایا جایا کرتا تھا۔''

والد صاحب نے حضرت باقی باللہؒ کے مزار کے جلال و ہیبت کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی کہ جالب صاحب جن کی عمر اس وقت گیارہ بارہ سال ہوگی دن ہو یا رات جب جی چاہتا چلے جاتے تھے۔ جبکہ لوگ دن میں بھی مزار شریف پر جاتے ہوئے گھبراتے تھے یہ پڑھ کر مجھے جالب صاحب کی ایک غزل کا مقطع یاد آ گیا۔ یہ غزل انہوں نے اسی (80) کی دہائی کے آخری سالوں میں کہی تھی۔

رات سے میں ڈرا نہیں جالب
کیوں نہ ہیبت مرے جلال پہ رات

دہلی آمد کا ذکر کرتے ہوئے جالب صاحب لکھتے ہیں:

(18) ''میرے بڑے بھائی دہلی میں ملازم ہو گئے انہیں سرکاری کوارٹر بھی مل گیا تھا۔ میرے ابا بھی وہیں کام کرنے لگے اور مجھے بھی اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ دلی میرے لیے اجنبی تھی کیونکہ میں بولتا تو اردو ہی تھا مگر مرا لہجہ پنجابی تھا۔ کچھ مہینوں تک تو ہم دلی کے لڑکوں کے طنز و مزاح کا نشانہ بنے رہے۔ مگر پھر ہم رواں ہو گئے۔ ہمارا لہجہ بھی درست ہو گیا اور ہمیں دلی کی زبان بھی آ گئی۔ پھر ''بلی ماراں'' کے لڑکے ہمارے دوست بن گئے۔ مگر مجھے اب وہ دوست یاد نہیں رہے۔ دلی میں بڑے بڑے اساتذہ رہتے تھے۔ میر و غالب کی دلی، سائل اور بیخود اس وقت زندہ تھے جنہوں نے غالب و داغ کو سن رکھا تھا۔ ان بزرگوں کو ہم نے سنا۔ میں بڑے

بھائی کے ساتھ مشاعروں میں سامع کی حیثیت سے جایا کرتا تھا۔ (میرے بڑے بھائی مشتاق مبارک خود بھی شاعر تھے، ان کا ایک قطعہ تو بہت مشہور ہے)''۔

دوستوں کی ستم ظریفی کو
ہم فقط اپنی سادگی سمجھے
دوست میرے خلوص کو اکثر
میرا احساسِ کمتری سمجھے

ادبی جریدہ ''آج کل'' دہلی جس کے ایڈیٹر حضرت جوش ملیح آبادی ہوا کرتے تھے، یہ رسالہ مرکزی محکمہ اطلاعات و مطبوعات (ہند) کے تحت شائع ہوتا تھا جہاں میرے بڑے بھائی بھی ملازم تھے، مجھے یاد ہے کہ جب اس میں مرزا یاس یگانہ چنگیزی کا کلام چھپتا تھا تو لکھا جاتا تھا ''یگانہ آرٹ'' اس اعزاز کے ساتھ جوش صاحب یاس یگانہ کی غزل چھاپتے تھے۔ دلی میں مشاعروں میں، میں نے مولانا ظفر علی خان، سائل دہلوی، بیخود دہلوی، جگر اور جرأت صاحب کو سنا۔ جرأت صاحب مشاعرے میں آتے پانچ چھ غزلیں پڑھیں، مشاعرہ لوٹا اور چلے گئے پھر اپنی کیفیت یا موڈ بنانے میں مصروف ہو جاتے یہ ان کا شراب کا دور ہوتا تھا اور پھر اسی کیفیت میں جرأت صاحب مشاعرے میں دوبارہ آتے اور ایک بار پھر مشاعرہ پر چھا جاتے۔ میں نے ایسا پڑھنے والا، اتنی خوبصورت رواں دواں غزل کہنے والا شاعر کوئی اور نہیں سنا۔ دہلی میں جمیل الدین عالی، فرید جاوید، عارف جلالی وغیرہ بھی تھے۔ مگر یہ سب نوآموز تھے۔

اجمیری گیٹ اسکول سے آٹھویں جماعت پاس کر کے میں اینگلو عربک ہائی اسکول موری گیٹ آ گیا۔ اسکول کے سامنے ایک مسجد تھی۔ جہاں تمام اساتذہ اور طالب علم نماز پڑھا کرتے تھے، نماز کے بعد دعا بھی ہوتی تھی۔ اسی صورت حال پر ایک مطلع ہو گیا، میری شعری زندگی کا دوسرا شعر کہ جب میں درجہ نہم کا طالب علم تھا۔

مدتیں ہو گئیں خطا کرتے
شرم آتی ہے اب دعا کرتے

بٹوارہ

جالب صاحب لکھتے ہیں:

(19) ''1947 میں ہندو مسلم منافرت عروج پر تھی۔ ہم لوگ بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے امرتسر سے کئی ریل گاڑیاں گزریں اور ان پر دونوں طرف سے قیامتیں ٹوٹیں۔ ہماری ٹرین بھی امرتسر پہنچی تو بتیاں بجھادی گئیں، بس زندہ رہنا تھا سو ہم 14 راگست 1947 کو کراچی پہنچ گئے۔ بڑے بھائی مشتاق نے محکمہ اطلاعات و مطبوعات حکومت پاکستان میں اپنی آمد کی اطلاع دی اور انہیں جٹ لائن میں سرکاری کوارٹر الاٹ کردیا گیا، ہمارے والد دہلی میں رہ گئے تھے، عید سر پر تھی اور انہوں نے کچھ کاروباری لین دین کے بعد پاکستان آنے کا فیصلہ کیا تھا کہ وہ شدید فسادات میں پھنس کر رہ گئے اور پھر ایک سال بعد کراچی آئے، جبکہ ہم انہیں مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ ہمارے بڑے دادا افضل محمد جو بٹوارے کے وقت گاؤں میں تھے ان کا بھی کچھ پتہ نہ چل سکا اور لاکھوں انسانوں کی طرح وہ بھی بٹوارے میں کام آ گئے۔

جب ہم کراچی پہنچے تو ہماری نانی ہمارے ساتھ تھیں اب ان کی عمر سو سال سے اوپر ہو چکی تھی، ایک دن میں کلیات نظیر پڑھ رہا تھا تو اس میں ایک شعر پر میں رک گیا۔

ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا

اسلام چھوڑ کفر لیا پھر کسی کو کیا

میں نے غور کیا اور نانی سے پوچھا۔ نانی وہ شعر تو سناؤ جو تم سنایا کرتی ہو 'ہم نے دل' تو نانی نے اسی طرح شعر سنایا، جیسے وہ سنایا کرتی تھیں۔

ہم نے دل صنم کو دِتا پھر کسی کو کیا
دِتا تو دِتا آپے دِتا پھر کسی کو کیا

میں نے نانی کو صحیح شعر سنایا اور کہا اب اس شعر کو غلط نہ پڑھنا اور خود یہ سوچنے لگا کہ یہ شعر سو سال پہلے پیدل چل کر ہمارے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ نظیر ایک عوامی شاعر تھا اور اس کا شعر عام آدمی تک با آسانی رسائی حاصل کر لیتا تھا۔"

برگِ آوارہ

حبیب جالب کے پہلے شعری مجموعے کا نام ''برگِ آوارہ'' ہے جو آج بھی مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اس مجموعے کے ملک اور بیرون ملک بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور آج کل معروف و تاریخی اشاعتی ادارہ ''مکتبہ دانیال'' کراچی اسے شائع کر رہا ہے، مگر پہلی بار جس اشاعتی ادارے نے برگِ آوارہ شائع کی تھی وہ بھی اپنے دور کا سب سے بڑا ادارہ تھا، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی اور برصغیر کے دیگر حرفِ اول کے شعرا و ادیبوں کی کتابیں ''مکتبہ کارواں'' لاہور ہی سے شائع ہوتی تھیں۔ 1956 میں جالب واہگہ کے راستے ہندوستان مشاعرہ پڑھنے گئے تھے اور جب وہ اسی راستے واپس لاہور آئے تو مکتبہ کارواں کے روحِ رواں چودھری عبدالحمید ان کے منتظر تھے۔ چودھری صاحب باذوق آدمی تھے اور خود شاعر بھی تھے۔ چودھری صاحب کیونکر ''برگِ آوارہ'' چھاپنے پر تیار ہوئے یہ احوال جالب صاحب سے سنتے ہیں:

(20) ''ہمارے ایک دوست اکرام الحق جالندھری تھے، وہ مکتبہ کارواں کے مالک چودھری عبدالحمید کے بھی بڑے دوست تھے۔ اکرام الحق بڑے ہی ملنسار اور صلح جو آدمی تھے کافی ہاؤس میں ہمارے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ ان کی یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ دو آپس میں لڑنے والوں کے بیچ صلح کروا دیتے تھے۔ مثلاً حمید نظامی سے کہنا کہ ''وہ تو آپ کی بڑی تعریف کر رہے تھے'' اور نظامی صاحب کے مخالف سے کہہ دینا ''نظامی صاحب تو آپ کی بڑی تعریف کر رہے تھے'' یوں آپس میں دونوں کو ملوا دینا یہ ان کی بہت اچھی عادت تھی وہ یاروں کے یار تھے۔ ہم دہلی مشاعرہ پڑھنے

گئے ہوئے تھے۔ پیچھے اکرام صاحب ایک روز مکتبہ کارواں گئے اور چوہدری عبدالحمید صاحب سے کہا "جالب صاحب آج کل دلی گئے ہوئے ہیں مشاعرہ پڑھنے اور وہ تو آپ کی بڑی تعریف کرتے ہیں کہ آپ بڑے اچھے شاعر ہیں۔ آپ کا ادارہ بڑا اچھا ہے" چوہدری صاحب نے بھی جواباً کہا "جالب صاحب کا کلام تھوڑا سا میں نے بھی سنا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کی کتاب چھاپی جائے لیکن سنتا ہوں کہ ترنم ہی ترنم ہے شعر تو وہ خود نہیں کہتے" چنانچہ ایک دن اکرام الحق مجھے مکتبہ کارواں لے گئے جو انارکلی میں قطب الدین ایبک کے مزار کے قریب ہی تھا، وہیں میں نے سعادت حسن منٹو کو بھی دیکھا تھا۔ جن سے بعد میں ملاقاتیں رہیں۔ چوہدری صاحب نے مجھ سے بھی وہی بات کی "جالب صاحب آپ کا کلام تو مجھے بے حد پسند ہے، لیکن ایک شک وشبہ ہے جو آپ کے شعرا کا ہی پھیلایا ہوا ہے کہ آپ خود شعر نہیں کہتے یہ میری الجھن دور کر دیں" پھر انہوں نے مجھ سے کہا "میں آپ کو ایک مصرعہ دیتا ہوں آپ چار پانچ شعر کہہ دیں، خیال کی پستی، بلندی کو فی الحال چھوڑ دیجیے گا" میں مسکرایا اور سوچا کہ کیسے کیسے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور شاعروں کے بارے میں تو میرا کہنا ہے کہ یہ کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ خیر میں نے پانچ چھ شعر وہیں لکھ دیے۔ چودھری صاحب نے شعر پڑھے اور بولے "میں مطمئن ہو گیا۔" برگِ آوارہ یوں شائع ہوئی کتاب کا سرورق حنیف رامے نے بنایا تھا "سرِ مقتل" کا سرورق بھی انہی نے بنایا"۔

سرِ مقتل کے ناشر بھی مکتبہ کارواں کے چودھری عبدالحمید تھے۔ جو سرِ مقتل شائع کرنے کے جرم میں جالب صاحب کے ساتھ قید ہوئے۔ پریس ضبط ہوا مکتبہ بند ہوا۔ خیر یہ بات آگے چل کر ہو گی۔

جالب صاحب کو چودھری عبدالحمید صاحب نے کتاب کی اشاعت کا اشارہ دیتے ہوئے۔ جلد از جلد مسودہ پہنچانے کے لیے کہا۔

جالب صاحب کو جتنی غزلیں یاد تھیں انہوں نے بیاض میں لکھ ڈالیں۔ کچھ نظمیں چند متفرق اشعار اب جو غور کیا۔ تو یہ کتاب کی مناسب ضخامت سے کہیں کم تھا۔ اسی فکرمندی میں وہ لاہور سے کراچی پہنچے۔ یہ 57-1956 کا واقعہ ہے۔ جالب صاحب نے گھر والوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ مکتبہ کارواں لاہور، میری کتاب شائع کر رہا ہے، اور یہ خبر سنانے کے بعد انہوں نے اپنی پریشانی کا بھی اظہار کیا کہ میرا کلام کہیں لکھا ہوا گھر میں محفوظ ہو، میری کوئی بیاض ہو تو مجھے دیں، مگر گھر والوں کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، جالب صاحب نے کبھی بیاض بنائی ہوتی تو بیاض ہوتی۔ وہ تو بس شعر کہتے اور کسی کاغذ کے پرزے یا سگریٹ کے پیکٹ کو سیدھا کر کے اس پر غزل لکھ لی۔ ہماری اکلوتی بہن رشیدہ آپا اسکول سے آئیں اور انہوں نے بڑے بھائی کو پریشان دیکھا تو پوچھا ''بھائی خیریت ہے کیوں پریشان ہیں؟'' بھائی صاحب شدید ذہنی اذیت سے گزر رہے تھے ایسے میں انہیں بہن کا پوچھنا دخل در معقولات لگا اور انہیں نے چھوٹی بہن کو جھڑک دیا ''چلو جاؤ اپنا کام کرو'' شاید زندگی میں پہلی بار اکلوتی اور لاڈلی بہن کو جالب صاحب نے یوں جھڑکا ہوگا۔ رشیدہ آپا خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ گئیں۔ بھائی کو بہن کے یوں خاموش بیٹھنے پر ملال ہوا، وہ اٹھے اور بہن کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے بولے ''میری شاعری کی کتاب چھپ رہی ہے، ملک کا بہت بڑا ناشر میری کتاب شائع کر رہا ہے۔ مگر کتاب کے لیے میرے پاس چند غزلوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے'' بھائی کی بات سن کر بہن فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اٹھی اور صندوق سے ایک پوٹلی نکال کر بھائی کے سامنے الٹ دی ''یہ لیں بھائی آپ کی شاعری، کاغذوں کے پرزے، سگریٹوں کے پھٹے پرانے پیکٹ اور ان پر لکھی غزلیں، نظمیں اور متفرق اشعار۔ جالب صاحب یہ سب دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گئے۔ ''رشیدہ تم نے یہ سب کیسے سنبھالا'' بہن بولیں ''بھائی جب آپ صبح بستر سے سو کر اٹھتے تھے تو بستر سمیٹتے ہوئے مجھے جو بھی کاغذات تکیے کے نیچے سے ملتے تھے۔ یا آپ کے کپڑے دھونے سے پہلے جیبوں سے جو کاغذوں کے پرزے نکلتے تھے میں یہ سب سمیٹ کر اس پوٹلی میں ڈال دیتی تھی یہ سب وہی کاغذات ہیں۔''

اس طرح برگِ آوارہ شائع ہوئی۔ جس کی اشاعت میں ہماری بہن رشیدہ کا کردار نہایت اہم ہے اور پھر حبیب جالب انتیس سال کی عمر میں صاحبِ دیوان شاعر بن گئے۔

''برگِ آوارہ'' ایک نوجوان غزل گو شاعر کا شعری مجموعہ تھا جو تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند دنیائے شعروادب میں داخل ہوا تھا۔ ''برگِ آوارہ'' کا پہلا ایڈیشن 1957 میں شائع ہوا تھا اور ادبی حلقوں میں حبیب جالب کا استقبال ایک تازہ کار رومانی غزل گو شاعر کی حیثیت سے کیا گیا تھا۔ ان کی غزلیں تو پہلے ہی ادب کے خاص و عام خصوصاً نوجوان طلباء و طالبات میں مقبول ہو چکی تھیں۔ اس زمانے میں احبابِ ادب نے جالب کو اختر شیرانی، ساحر اور مجاز کا حسین تسلسل بھی کہا کیونکہ ان شعراء کے ہاں بھی خوبصورت معاشرے کے قیام کی خواہشات کے بڑے واضح اور بکثرت اشارے موجود تھے اور جالب کی ''برگِ آوارہ'' میں بھی دھیما دھیما احتجاج اور مزاحمت موجود ہیں۔

جالب کی شاعری کی اساس، اس کا ''شوقِ آوارگی'' ہے۔ جالب نے زندگی کو یقیناً برتا ہے۔ جالب خرابوں سے بھرپور انداز میں گزرا ہے۔ شہر شہر، گاؤں گاؤں، بستی بستی، قریہ قریہ وہ سچ کو ''تلاشتا'' رہا۔ جالب کی یہ غزل اس کی سوچ کے حوالے سے نمائندہ غزل کہی جا سکتی ہے۔ یہ غزل جالب کی زندگی کا وہ راستہ ہے جس پر آخری سانس تک وہ چلتا رہا۔ گویا اس غزل کے ذریعے اس نے اپنی منزل کا تعین اور راستے کا انتخاب کر لیا تھا۔ غزل ملاحظہ ہو۔

آج اس شہر، میں کل نئے شہر میں، بس اسی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا، شوقِ آوارگی
اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے فتنہ گر لوگ تھے
زخم کھاتا رہا، مسکراتا رہا، شوقِ آوارگی
کوئی پیغام گل تک نہ پہنچا مگر، پھر بھی شام و سحر
ناز بادِ چمن کے اٹھاتا رہا، شوقِ آوارگی
کوئی ہنس کے ملے، غنچہءِ جاں کھلے، چاک دل کا سلے
ہر قدم پر نگاہیں بچھاتا رہا، شوقِ آوارگی

دشمن جاں فلک، غیر ہے یہ زمیں، کوئی اپنا نہیں

خاک سارے جہاں کی اڑاتا رہا، شوقِ آوارگی

پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں ڈاکٹر عندلیب شادانی بطور نقاد بھی ایک بڑا نام تھا۔ شادانی صاحب اپنے زمانے کے مقبول شاعر بھی تھے۔ آپ نے ڈھاکہ (مشرقی پاکستان حال بنگلہ دیش) سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ''ندیم'' میں ''برگِ آوارہ'' کو حوالہ بنا کر ایک تنقیدی مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون 1960 میں شائع ہوا تھا اور بعد ازاں برگِ آوارہ میں اسے بطور مقدمہ شامل کر لیا گیا۔ چونکہ ہم برگِ آوارہ کے زمانے میں ہیں تو ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب کا مضمون پڑھتے چلیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

(21) ''ایک سال ہونے کو آیا، دہلی کی بزمِ سخن میں پاکستان کے ایک جواں سال شاعر حبیب جالب کو دیکھا اس کا کلام اس کی زبان سے سنا، اب تک اس کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے، اور اس کی صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں نامرادیوں کی ترجمان، کتنا درد، کتنا سوز، کتنی کسک تھی اس کی آواز میں، کتنی تڑپ، کتنا گداز، کتنی دلآویزی تھی اس کے اشعار میں کہ کانوں تک پہنچتے ہی دل میں اتر جاتے اور سننے والے کو بے اختیار شاعری کی زندگی کے غم کدوں میں لے جاتے۔ اس کی رودادِ حیات کے منتشر اجزاء میں نے اس کے اشعار سے جمع کیے ہیں اس سے زیادہ میں اس کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا۔''

پچھلے چند سال میں طوفانِ حوادث نے کتنی ہی پرسکون بستیوں کو انقلاب کا گہوارہ بنا دیا اور کتنے امن پسند انسانوں کو وطن آوارہ کر دیا۔ خدا جانے کن حالات کی چیرہ دستیوں نے اس جواں سال شاعر کو وطن سے اٹھا کر غربت میں پھینک دیا جواں دل کی ساری امنگیں، سارے ولولے سسک سسک کر موت کی گود میں جا سوئے گزری ہوئی دل نواز ساعتوں کی جاں گداز یادوں کے سوا، اب کچھ بھی اس کے پاس باقی نہیں رہا۔

مولانا غنیمت نے پنجاب کو ''حسن آباد'' اور ''انتخاب ہفت کشور'' کہا تھا۔ لاہور اسی ''حسن آباد'' اور انتخاب ہفت کشور'' کا دل ہے۔ تہذیب وتمدن کا مرکز، حسن و جمال کا گھوارہ۔ نئی اصطلاح کے مطابق شہر نگاراں اور روشنیوں کا شہر'' جہاں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ایک خوش ذوق انسان تمنا کر سکتا ہے۔ یہ حرماں نصیب شاعر بھی اسی رومانی بستی میں کہیں رہتا ہے۔ مگر یہاں کی سب کچھ بھلا دینے والی نشہ آور زندگی، چھوٹ جانے والے دیس کی محبوب یادیں اس سے نہ چھین سکیں۔ اس کی زبان سے اس سرزمین کا تذکرہ سنیے تو دل بے اختیار اس طرف کھنچنے لگتا ہے۔ فطرت کے دل کشا مناظر کا ایک طویل سلسلہ آنکھوں کے سامنے پھیل جاتا ہے اور گوناں گوں جذبات کا سمندر موجیں مارنے لگتا ہے۔

پہاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی
جہاں ہم دلِ نغمہ خواں چھوڑ آئے
وہ سبزہ، وہ دریا، وہ پیڑوں کے سائے
وہ گیتوں بھری، بستیاں چھوڑ آئے
حسیں پنگھٹوں کا وہ چاندی سا پانی
وہ برکھا کی رت، وہ سماں، چھوڑ آئے
بہت مہرباں تھیں وہ گل پوش راہیں
مگر ہم انہیں مہرباں چھوڑ آئے

وہ حسین پھول وہ سبزہ، وہ فسوں ساز دیار
وہ مدھر گیت، محبت بھرے دریاؤں کے

وہ سرسبز و شاداب وادی، وہ گاتی گنگناتی ہوئی ندیاں، وہ گھنیرے درخت، وہ ہرے بھرے کھیت، وہ گل پوش سبزہ زار اور وہ فضا میں گونجتے الہڑ البیلی معصوم دوشیزاؤں کے مدھر گیت۔ ایسی رومانی فضا میں سانس لینے والے انسان سے اگر حوادث روزگار یہ روح پرور ماحول چھین لیں تو اس کے دل میں کس طرح نشتر نہ ٹوٹیں گے۔ درحقیقت صرف ندیوں کے گیت اور گل پوش وادی

ہی اس سے نہیں چھوٹی بلکہ وہ متاعِ عزیز بھی اس سے چھن گئی۔ جسے وہ غزل، کبھی جانِ غزل، کبھی مہتاب، کبھی نزہتِ مہتاب اور کبھی نازشِ خورشید کہتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں ترا نام نہ لوں
میں تجھے مہتاب کہہ لوں گا

اے نزہت مہتاب، ترا غم ہے مری زیست
اے نازشِ خورشید ترا غم ہے مری جاں

یہی سب ہے کہ جب وہ اپنے دیس کو کہ وہی دیارِ محبوب بھی ہے یاد کرتا ہے تو اس کا لفظ لفظ حسرت و نامرادی کی تفسیر بلکہ تصویر بن جاتا ہے۔ اس کی رودادِ حیات ایک سیدھا سادہ المیہ ہے۔ کوئی غیر معمولی نادر یا عظیم سانحہ نہیں۔ ہماری سوسائٹی میں اس قسم کی الم انگیز داستانیں خدا جانے ہر روز کتنی بار دہرائی جاتی ہیں۔

اس کے دل میں احساسِ محبت جاگ اٹھا ہے، اور نیاز حریم ناز تک جا پہنچتا ہے تمنا کی پذیرائی لطف و کرم سے ہو رہی ہے۔ محبت کا جواب محبت سے مل رہا۔ چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہوتی ہیں لوگوں کو پتہ لگ گیا ہے اور وہ اس سلسلے کو منقطع کر دینا چاہتے ہیں۔ شاعران دراندازیوں کی اور ان کے طرزِ عمل کی مذمت کرتا ہے۔ ہر چند لوگ سدِ راہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ خطروں میں پڑ کر اور نگہبانوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر اپنی محبوبہ تک پہنچ ہی جاتا ہے۔

تو رنگ ہے غبار ہیں تیری گلی کے لوگ
تو پھول ہے شرار ہیں تیری گلی کے لوگ
تو رونقِ حیات ہے، تو حسنِ کائنات
اجڑا ہوا دیار ہیں تیری گلی کے لوگ
تو پیکرِ وفا ہے، مجسم خلوص ہے
بدنامِ روزگار ہیں تیری گلی کے لوگ
پھر جا رہا ہوں تیرے تبسم کو لوٹ کر
ہر چند ہوشیار ہیں تیری گلی کے لوگ

محبت کی نا قابلِ فہم زود رنجیاں کہاں نہیں ہوتیں۔ محبت کرنے والوں کے درمیان کبھی کبھی بے بات کی بات پر آزردگی پیدا ہو جاتی ہے، پھر آپ ہی آپ صلح ہو جاتی ہے نہ اس کی کوئی معقول وجہ ہوتی ہے اور نہ اس کی۔ غالبًا اسی قسم کی کوئی بات ہوئی کہ اس نے کوئے محبوب میں جانا چھوڑ دیا۔ یہ کھنچے تو وہ کیوں جھکیں۔ کہلا بھیجا کہ ہم ایسے ہی بُرے ہیں اور ہمارے یہاں آنا آپ کے لیے ننگ و عار ہے تو پھر اس شہر ہی کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ نہ آپ یہاں ہوں گے نہ ملنے کا سوال پیدا ہوگا اس نے جواب دیا۔

یہ اور بات تیری گلی میں نہ آئیں ہم
لیکن یہ کیا کہ شہر تیرا چھوڑ جائیں ہم

مگر پھر آزردگی کچھ اور بڑھ گئی اور بالآخر اس نے کہہ دیا کہ اچھا تمہاری ایسی ہی خوشی ہے کہ ہم اس شہر سے جائیں تو ہمیں اس میں بھی کوئی عذر نہیں۔ تمہاری یاد تو بہر حال میرے ساتھ جائے گی اور ساتھ رہے گی۔ مگر جانے سے پہلے ایک تمنا ہے وہ پوری کردو بس آخری بار ایک غزل سن لو۔ زندگی میں پھر ایسا موقع کاہے کو آئے گا۔

پھر کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
ہم ترا شہر چھوڑ جائیں گے
دُور اُفتادہ بستیوں میں کہیں
تیری یادوں سے لو لگائیں گے
شمع ماہ و نجوم گل کر کے
آنسوؤں کے دیے جلائیں گے
آخری بار اک غزل سن لو
آخری بار ہم منائیں گے
صورتِ موجۂ ہوا جالب
ساری دنیا کی خاک اُڑائیں گے

غرض ناز و نیاز کے یہ سلسلے ایک مدت تک اسی طرح چلتے رہے اور بالآخر وہ وقت آپہنچا کہ ایک

بیگانے کی دولت و عمارت ان کی محبت کے درمیان حائل ہوگئی۔ والدین کو لڑکی کی شادی کی فکر ہوئی۔ دولت نے حسن کو خرید لیا۔ محبت محروم ہوگئی۔

شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے، زور و شور سے تیاریاں ہو رہی ہیں، نامراد چاہنے والا دھک دھک کرنے والے دل کو سنبھالے اس جاں گسل ساعت کا منتظر ہے۔ محبوب کو پالینے کے تمام امکانات تھوڑی دیر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت اس کا دماغ کن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، سنیے۔

آخرِ کار یہ ساعت بھی قریب آ پہنچی
تو مری جان کسی اور کی ہو جائے گی
کل تلک میرا مقدر تھی، تری زلف کی چھاؤں
کیا قیامت ہے کہ اب غیر کی کہلاؤ گی
میرے غم خانے میں تم اب نہ کبھی آؤ گی
تیری سہمی ہوئی معصوم نگاہوں کی زباں
میری محبوب! کوئی اجنبی کیا سمجھے گا
کچھ جو سمجھا بھی تو اس عین خوشی کے ہنگام
تیری خاموش نگاہی کو حیا سمجھے گا
تیرے بہتے ہوئے اشکوں کو ادا سمجھے گا
میری دم ساز زمانے سے چلی آتی ہے
رہن غم وقفِ الم سادہ دلوں کی آنکھیں
یہ نیا ظلم نہیں پیار کے متوالوں پر
ہم نے دیکھیں یونہی نم سادہ دلوں کی آنکھیں
اور رولیں کوئی دم سادہ دلوں کی آنکھیں

یہ نظم فقط شاعر کے ذاتی تاثرات کا اظہار ہی نہیں بلکہ سماج کی دھاندلی پر ایک دل نشین اور دھیمی دھیمی طنز بھی ہے۔ جو غیر محسوس طریقے سے قاری کو متاثر کرتی اور اسے سماج کی اس زبردستی کے خلاف بغاوت پر اکساتی ہے۔

آخر شادی ہوگئی۔ دلہن رخصت ہو رہی ہے۔ شاعر کی نظروں میں دنیا اندھیر ہوگئی ہے۔ ایک طرف محبوب کی الم نصیبی کا احساس، اس کا کلیجہ شل ہو رہا ہے۔ ہائے اس ناز پروردہ کا نازک دل کیوں کر اس غم واندوہ کا متحمل ہوگا۔ دوسری طرف خود اپنے دل سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اپنی نامرادی کا تصور، جاں گسل اور روح فرسا ہے۔ طرح طرح کے خیالات دل میں آرہے ہیں اور اشعار میں ڈھلتے جارہے ہیں۔

تو کلی نزہتوں، نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل سوئے صحرا چلی
وہ سلگتا دیا تو سحر کی کرن
سوچتا ہوں یہی کیسے بہلے گا من
دھڑکنوں کو سکوں کیسے بخشے گا دھن
لوگ تجھ کو کہیں گے، نصیبوں جلی
تو جہاں سے گزرتی تھی شام و سحر
اب کہاں کہکشاں، وہ حسیں رہ گزر
شام غم چھائی ہے، دیکھتا ہوں جدھر
کتنی ویران ہے آج تیری گلی
تُو کلی، نزہتوں، نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل، سوئے صحرا چلی

کتنی سادہ کتنی لطیف اور کتنی حسین ہے یہ نظم کتنی رواں دواں اور خوش آہنگ اور کتنی پرتاثیر، معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے قلم کو اپنے دل کے خون میں ڈبو کر لکھا ہے۔ اس سانحے کے بعد شاعر کی زندگی کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ اب تک صرف ''غم جاناں'' سے سابقہ تھا اس کے بعد ''غم دوراں'' سے مقابلہ ہے۔ ایک غریب الدیار انسان، بیگانے دیس میں، محبت سے محروم، رفاقت کا بھوکا، کسی سہارے کی تلاش میں سرگرداں ہے اور کوئی سہارا نہیں ملتا۔ اس کی نغمہ سنجی، نوحہ گری میں تبدیل ہوگئی

ہے۔خوش نصیب لوگ مسرور ہیں کہ حوادثِ روزگار نے ایک نئے اور خوش آئند دور کا آغاز کیا ہے مگر شاعر کا حساس دل اور حقیقت نگر آنکھیں، خوشی کو ڈھونڈتی ہیں اور نہیں پاتیں۔

گلشن کی فضا دھواں دھواں ہے
کہتے ہیں بہار کا سماں ہے
بکھری ہوئی پتیاں ہیں گل کی
ٹوٹی ہوئی شاخِ آشیاں ہے
جس دل سے ابل رہے تھے نغمے
پہلو میں وہ آج نوحہ خواں ہے
ہم ہی نہیں پائمال تنہا
اے دوست تباہ اک جہاں ہے
ماہتاب صفت لوگ یہاں خاک بسر ہیں
ہم محو تماشائے سرِ راہ گزر ہیں
حسرت سی برستی ہے درو بام پہ ہر سو
روتی ہوئی گلیاں ہیں، سسکتے ہوئے گھر ہیں

مگر شاعر کی خودداری اور غیرت مندی ہر حال میں اپنی عزت نفس کی محافظ ہے اسے دولت کے بوجھ سے نہیں جھکایا جاسکتا، محبت کے زور سے رام کیا جاسکتا ہے۔

بک جائیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سرِ بازار
ہم یوسفِ کنعاں ہیں نہ ہم لعل و گہر ہیں
ہم لوگ ملیں گے تو محبت سے ملیں گے
ہم نزہتِ مہتاب ہیں، ہم نورِ سحر ہیں

اسی عالم میں بیتے ہوئے دنوں کی یادیں اکثر اسے گھیر لیتی ہیں اور اس کا دل حسرتوں میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ مجبور آزادیاں، وہ محبوب کی پرستاریاں، وہ نشاط آگیں خلوتیں، وہ شعروسخن کی

صحبتیں، ایک ایک کر کے سامنے آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں، مگر یہ حسرتیں، یہ نامرادیاں، ہر روز اس کی صلاحیتوں کو نکھار کے اسے ایک بہترین فنکار بناتی جا رہی ہیں۔

لوک گیتوں کا نگر یاد آیا
آج پردیس میں گھر یاد آیا
جب چلے آئے چمن زار سے ہم
التفاتِ گل تر یاد آیا
ہم زمانے کے ستم بھول گئے
جب ترا لطفِ نظر یاد آیا
تم بھی مسرور تھے اس شب سرِ بزم
اپنے شعروں کا اثر یاد آیا
پھر ہوا دردِ تمنا بیدار
پھر دلِ خاک بسر یاد آیا
ہم جسے بھول گئے تھے جالب
پھر وہی راہ گزر یاد آیا

اور یہ تاثرات آہستہ آہستہ اتنے شدید ہو جاتے ہیں کہ دل بے اختیار دیارِ محبوب کی طرف کھچنے لگتا ہے۔ ہر چند کہ محبوب سے ملنے کا کوئی امکان نہیں، کوئی امید نہیں، پھر بھی ایک موہوم کشش، تمام خطرات سے بے نیاز کر کے ''ادھر'' چلنے پر مجبور کرتی ہے۔

پھر دل سے آ رہی ہے صدا اُس گلی میں چل
شاید ہے غزل کا پتا، اُس گلی میں چل
وہ بام و در، وہ لوگ، وہ رسوائیوں کے زخم
ہیں سب کے سب عزیز جدا اُس گلی میں چل
اُس پھول کے بغیر بہت جی اداس ہے

مجھ کو بھی ساتھ لے کے صبا، اُس گلی میں چل
دنیا تو چاہتی ہے یونہی فاصلے رہیں
دنیا کے مشوروں پہ نہ جا اُس گلی میں چل
جالب پکارتی ہیں وہ شعلہ نوائیاں
یہ سرد رُت، یہ سرد ہوا، اس گلی میں چل

جالب کے اشعار کا مطالعہ کرنے والا اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ جالب کی رودادِ حیات اس کے دماغ کی اختراع نہیں بلکہ حالات کی پیداوار ہے اس نے سوچ سوچ کر دماغ سے مضامین پیدا نہیں کیے بلکہ اس نے اپنے محسوسات اور واقعات کو اشعار کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس کے اشعار میں تاثیر اور سوز و گداز کا بڑا سبب، اس کے جذبات کا خلوص اور صداقت ہے۔ حسن بیان کی دلآویزی نے اس میں اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس کی تشبیہات میں تازگی اور استعاروں میں ندرت ہے۔ مصرعوں کی چستی، روانی اور خوش آہنگی پڑھنے والے پر ایک خوشگوار اثر چھوڑ جاتی ہے۔ سادگی و پرکاری کے کرشمے جا بجا نظر آتے ہیں۔ بحریں عموماً ایسی اختیار کی ہیں جو مترنم ہونے کے ساتھ غم آگیں خیالات و حالات کے اظہار کے لیے نہایت موزوں ہیں اور شدت تاثیر میں اضافہ کرتی ہیں۔ حسین ترکیبیں اور ان کا اچھوتا پن قدم قدم پر دامن نظر کو تھام لیتا ہے۔ مطالعے کے دوران تابناکیاں اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ اس لیے میں ان کی نشاندہی ضروری نہیں سمجھتا۔ اس زمانے میں کہ جب صحتِ زبان کی طرف سے عام طور پر بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ''برگِ آوارہ'' شروع سے آخر تک زبان کی اغلاط سے پاک ہے۔ پوری کتاب میں دو شعر ایسے نظر آئے جو قواعد زبان کی رو سے محلِ نظر ہیں۔ ''برگِ آوارہ'' کا اغلاطِ زبان سے پاک ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ لکھنے والا زبان کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہے اور اس کے استعمال پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

''برگِ آوارہ'' کو جالب کی آپ بیتی کہنا یقیناً درست ہے۔ جہاں سے کھولیے جہاں سے پڑھیے شاعر کی زندگی کا کوئی نہ کوئی واقعہ سامنے آجاتا ہے اب میں ''برگِ آوارہ'' سے چند اشعار نقل کرتا

ہوں اور اربابِ ذوق کو دعوتِ فکر و نظر دیتا ہوں۔

شاید بقیدِ زیست وہ ساعت نہ آسکے
تم داستانِ شوق سنو اور سنائیں ہم

بہار آکے چلی بھی گئی مگر جالب
ابھی نگاہ میں وہ لالہ زار پھرتے ہیں

اُس گلی میں کیا کھویا، اِس گلی میں کیا پایا
تشنہ کام پہنچے تھے، تشنہ کام لوٹ آئے

پھر رہی ہیں آنکھوں میں تیرے شہر کی گلیاں
ڈوبتا ہوا سورج، تیرتے ہوئے سائے

اک عمر رہے منتظرِ عہدِ بہاراں
اک عمر اسیرِ خلشِ خام رہے ہم

اُس پھول کو پانا تو بڑی بات ہے جالب
اُس پھول کو چھونے میں بھی ناکام رہے ہم

اجنبی دیاروں میں پھر رہے ہیں آوارہ
اے غمِ جہاں تونے یہ بھی دن دکھائے ہیں

تیرے بام و در سے دور، تیری رہ گزر سے دور
رات کی سیاہی ہے، تیرگی کے سائے ہیں

اس نگاہ سے جالب، رسم وراہ کی خاطر
ہم نے کم نگاہوں کے ناز بھی اٹھائے ہیں

میرے نزدیک جالب اساساً غزل کا شاعر ہے اس لیے میں نے اپنے تاثرات کے اظہار کو صرف اس کی غزل تک محدود رکھا ہے۔ جالب کی غزل کے متعلق دو باتیں خصوصیت کے ساتھ

ذکر کے قابل ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے ہاں انفرادیت کی وجہ وہی ہے کہ اس کے یہاں جو کچھ ہے حال ہے قال نہیں ہے، اور ہے بھی تو برائے نام۔ انفرادیت، لچر اور پوچ قسم کی بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن جالب کی انفرادیت مستحسن ہے۔ مذموم نہیں۔ آج اردو غزل گو شعرا کا شمار مشکل ہے۔ ان سب کے کلام میں یکسانی پائی جاتی ہے اور اس یکسانی کا سبب یہ ہے کہ وہ اکثر رسمی اور تقلیدی غزل کہتے ہیں نہ خیالات ان کے اپنے ہوتے ہیں، نہ طرزِ ادا۔ مقررہ مضامین کو مقررہ سانچوں میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی قالب یا سانچے سے جو چیزیں نکلیں گی وہ لازماً یکساں ہوں گی۔ خصوصاً جبکہ وہ ایک ہی مادے سے تیار کی گئی ہوں۔ جالب کا مواد بھی اپنا ہے اور مواد کی مناسبت سے سانچا بھی اپنا۔ اس لیے وہ جو کچھ کہتا ہے اس میں انفرادیت جلوہ گر ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ جالب نے اپنی غزل کو داخلی واردات کے بیان تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اپنے دور کے سماجی اور سیاسی حالات کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ ان موضوعات پر اس کی طنزیہ نظمیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظموں میں بھی جالب کا اپنا انفرادی رنگ نمایاں ہے۔

میں اس مضمون کو "برگِ آوارہ" کی سب سے پہلی غزل پر تمام کرتا ہوں۔

دل کی بات لبوں پر لاکر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں
بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں
ایک ہمیں آوارہ کہنا، کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے، دِل والوں کو، اور بہت کچھ کہتے ہیں
جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا، جن کے لیے بدنام ہوئے
آج وہی ہم سے بیگانے، بیگانے سے رہتے ہیں
وہ جو ابھی اس راہ گزر سے چاک گریباں گزرا تھا
اُس آوارہ دیوانے کو جالب جالب کہتے ہیں

''برگِ آوارہ'' حبیب جالب کی پہلی کتاب ہے۔ اس لیے جالب کی مکمل شاعری کی بنیاد ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مضمون کے بعد میں چاہوں گا کہ ممتاز ترقی پسند ادیب شاعر اور نقاد جناب احمد ہمدانی کے مضمون ''جالب۔ بے چین روح کی آواز'' سے بھی استفادہ کر لیا جائے۔ ہمدانی صاحب لکھتے ہیں:

(22) ''حبیب جالب کی شاعری ایک بے چین روح کی آواز ہے، ایک ایسی بے چین روح کی آواز جو ہر لحظہ بدلتی کائنات کے سروں سے سر ملانے میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہے۔ حبیب جالب کی شاعری کا پورا سفر انسان اور کائنات کے مابین ہم آہنگی کی تلاش ہے۔ کسی ایسے معاشرے میں سکون کا سانس نہیں لیا جا سکتا جو انسان و کائنات کے مابین ہم آہنگی سے عاری ہو۔'' آیئے جالب کے کچھ اشعار سنیے ۔

ایک ہمیں آوارہ کہنا، کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے، دِل والوں کو، اور بہت کچھ کہتے ہیں

وہ جو ابھی اس راہ گزر سے چاکِ گریباں گزرا تھا
اُس آوارہ دیوانے کو جالب جالب کہتے ہیں

مدت ہوئی ہے کوئے بتاں کی طرف گئے
آوارگی سے دِل کو کہاں تک بچائیں ہم

صورتِ موجۂ ہوا جالب
ساری دنیا کی خاک اڑائیں گے

یہ اعجاز ہے حسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے، داستاں چھوڑ آئے

نظر نظر میں لیے تیرا پیار پھرتے ہیں
مثالِ موجِ نسیمِ بہار پھرتے ہیں

جالب ایک آوارہ، الجھنوں کا گہوارہ
کون اس کو سمجھائے کون اس کو سلجھائے

ان تمام اشعار کے پیچھے ایک مضطرب و متحرک شخصیت نظر آتی ہے۔ جس کا ''شوقِ آوارگی'' اس کے خمیر میں شامل ہے۔ اسی ''شوقِ آوارگی'' کی بدولت جالب اپنی شاعری میں ایک مسلسل حرکت کی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کے یہاں ٹھوس اور جامد مصرعوں کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے مصرعے اس کے خیال کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آگے بڑھنے کا یہ عمل کبھی الفاظ اور بحور کے فنکارانہ استعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اور کبھی متحرک تمثیلوں اور استعاروں سے پیدا ہوتا ہے۔ جالب کے یہاں لفظ ''آوارہ'' کا مسلسل استعمال اور کیفیت، آوارگی کا متواتر اظہار یونہی کچھ اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ یہ اس کی باطنی کیفیت کا اظہار ہے۔ اس کی باطنی کیفیت جو زندگی سے اس کے حقیقی تعلق کا نتیجہ ہے، وہ زندگی سے پیار بھی کرتا ہے اور زندگی کی خستگی پر روتا بھی ہے۔ لیکن نہ وہ زندگی سے پیار کے عالم میں آپے سے باہر ہوتا ہے اور نہ زندگی کی خستگی پر روتے وقت مایوسیوں کے گہرے غار میں جا گرتا ہے۔ رنج اور غم دونوں میں سنبھلا رہنا جالب کے فن کی پہچان ہے اور اس کی شخصیت کی بھی۔ غزل ایک بڑی نازک صنف سخن ہے، یہ رمزیت و سریت کی فضاؤں میں پروان چڑھتی ہے اور ایک سخن زیرِ لب سے ہزار داستانوں کا مزہ پیدا کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ غزل لکھنا ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔ جالب کو گفتگوئے زیرِ لب کا فن بھی آتا ہے اور اسے رمزیت و سریت کی فضاؤں میں پرواز سے شغف بھی ہے۔ لہٰذا اس کی غزل سے کبھی لطفِ غزل کا دامن چھوٹتا نظر نہیں آتا۔ جالب مارے باندھے کی فضا پیدا کرنے کا قائل نہیں ہے وہ صرف وہی رمزیت اپنی غزلوں میں اجاگر کرتا ہے جو اس کے وجود کا حصہ ہے۔ گو وہ اپنے وجود کے اظہار کو ہمہ رمزیت بنا دیتا ہے، اسکی صورت ہم کلامی کے انداز میں اس کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتی ہے وہ اپنی ذات سے کچھ اس طرح محوِ کلام ہوتا ہے کہ کلام کا رخ اس کی ذات کے ساتھ اس کے سامعین اور قارئین کی طرف بھی مڑ جاتا ہے،

جس سے عجیب طرح کی رمزیت پیدا ہوتی ہے اور اس کے کلام سے ''من تو شدی تو من شدی'' کی کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ یہ اشعار سنیے۔

اُس کے بغیر آج بہت جی اُداس ہے
جالب چلو کہیں سے اسے ڈھونڈ لائیں ہم

دنیا تو چاہتی ہے، یونہی فاصلے رہیں
دنیا کے مشوروں پہ نہ جا، اس گلی میں چل

اگر دامن نہیں، ان کا میسر
کسی دیوار ہی سے لگ کے رولیں

کوئی جو آبسے دل میں تو جالب
کبھی اس گھر کے دروازے نہ کھولیں

یہ شہر جہاں ہم ہیں، یہاں کون ہے اپنا
یہ بات ہی کیا کم ہے، یہاں بیت گیا دن

نور بکھرا ہے رہگزاروں میں
وہ ادھر سے گزر گئے ہوں گے

جالب کی وارفتگی و آشفتہ سری کبھی اپنا ناتا، روحِ تغزل سے منقطع نہیں ہونے دیتی جس کی وجہ سے اس کے اشعار میں نغمگی کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس ہوتی ہے، یہ نغمگی کبھی بہت نمایاں ہوتی ہے اور کبھی سمندر کی گہرائیوں میں موجود موج کی طرح سخن زیرِ لب کا سا انداز اختیار کیے رہتی ہے۔ چند شعر سنیے۔

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
ترے شہر میں اک جہاں چھوڑ آئے

کتنی دور چلا آیا ہوں، چھوڑ کے تیری بستی کو
لیکن دل تیری گلیوں میں آج تلک سرگرداں ہے

جالب آپ اس جان غزل کے پیار سے لاکھ انکار کریں
آنکھوں کی پرسوز چمک سے دل کا درد نمایاں ہے

ماورائے جہاں سے آئے ہیں
آج ہم خُم ستاں سے آئے ہیں
اس قدر بے رخی سے بات نہ کر
دیکھ تو ہم کہاں سے آئے ہیں
اس قدر تو برا نہیں جالب
مل کے ہم اس جواں سے آئے ہیں

مے کدے میں کہ بزم جاناں تک
اور جالب کدھر گئے ہوں گے

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ جالب کی غزلوں کی نغمگی بھی اس کی رمزیت کی طرح کوئی مارے باندھے کی چیز نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق بھی اس کے تصورِ حیات وکائنات سے ہے، رمزیت، سریت اور نغمگی کے علاوہ جو چیز غزل کو غزل بناتی ہے، وہ غزل کا رچاؤ ہے اور یہ پوری شعری روایت کے ادراک سے حاصل ہوتا ہے، جالب کی غزلوں میں اس رچاؤ کے نمونوں کی کوئی کمی نہیں۔ مثال کے طور پر یہ کچھ شعر سنیے۔

صبح بے نور، شام بے مایہ
لٹ گئی دولتِ نگاہ کہاں

کبھی تو مہرباں ہوکر بلالیں
یہ مہوش ہم فقیروں کی دعا لیں

زمانہ تو یونہی روٹھا رہے گا
چلو جالب انہیں چل کر منالیں

ایک شاعر، جواپنے محبوب کے وصال وفراق کے نغمے گاتا چلا جارہا تھامگر کہیں کہیں معاشرے اور سماج کی ناہمواریاں اوران کے خلاف اظہار بھی اس کی شاعری میں درآ تا تھا، گویادھیمی دھیمی سی چنگاریاں موجود تھیں کبھی کبھی یہ دبی ہوئی چنگاریاں۔ باقاعدہ سلگنے لگتیں اور شاعر مسلسل ایسے شعر کہتا۔

بجلیوں کی یورش سے شاخ شاخ لرزاں ہے
کیا یہی بہاراں ہے، کیا یہی گلستاں ہے
آج بھی نگاہوں سے وحشتیں نہیں جاتیں
آج بھی نگاہوں میں کائنات ویراں ہے
گلشن کی فضا دھواں دھواں ہے
کہتے ہیں بہار کا سماں ہے
بکھری ہوئی پتیاں ہیں گل کی
ٹوٹی ہوئی شاخِ آشیاں ہے
جس دل سے ابھر رہے تھے نغمے
پہلو میں وہ آج نوحہ خواں ہے
جالب وہ کہاں ہے عشق تیرا
پیارے وہ غزل تری کہاں ہے

مہتاب صفت لوگ یہاں خاک بسر ہیں
ہم محوِ تماشائے سرِراہ گزر ہیں
حسرت سی برستی ہے درو بام پہ ہر سو
روتی ہوئی گلیاں ہیں، سسکتے ہوئے گھر ہیں

آئے تھے یہاں جن کے تصور کے سہارے
وہ چاند، وہ سورج، وہ شب و روز کہاں ہیں

شہر ویراں اداس ہیں گلیاں
رہگزاروں سے اٹھ رہا ہے دھواں
آتش غم میں جل رہے ہیں دیار
گرد آلود ہے رخِ دوراں
بستیوں پر غموں کی یورِش ہے
قریہ قریہ ہے وقفِ آہ و فغاں

اور پھر ''برگِ آوارہ'' کا شاعر پورے یقین کے ساتھ ''منزل'' کا پتا دے رہا ہے ۔

کٹی اب کٹی منزلِ شام غم
بڑھائے چلو پافگارو و قدم
ہمیں سے فروزاں ہے شمعِ وفا
ہمیں نے بھرا ہے محبت کا دم
کہیں یاس کے حوصلے بڑھ نہ جائیں
کہیں آس کے رک نہ جائیں قدم
پڑھے گا زمانہ بڑے شوق سے
کیے جاؤ دل کی کہانی رقم
بدل جائے گا، دیکھتے دیکھتے
یہ عہدِ خرابی، یہ عہدِ ستم
نکلنے کو ہے آفتابِ سحر
شبِ تار ہے بس کوئی اور دم

مٹا کر اندھیروں کا نام و نشاں
اجالوں کی بستی بسائیں گے ہم

شاعر، غم جاناں سے غم دوراں کی جانب تیزی سے بڑھ رہا ہے اس نے فیصلہ کرلیا ہے اور وہ اپنے محبوب سے کہہ رہا ہے ۔

اب تیری ضرورت بھی بہت کم ہے مری جاں
اب شوق کا کچھ اور ہی عالم ہے مری جاں
اب تذکرہء خندہء گل بار ہے جی پر
جاں وقفِ غم گریہء شبنم ہے مری جاں
رُخ پر ترے بکھری ہوئی، یہ زلف سیہ تاب
تصویرِ پریشانیء عالم ہے مری جاں
ہم سادہ دلوں پر یہ شبِ غم کا تسلط
مایوس نہ ہو اور کوئی دم ہے مری جاں

شاعر طویل جدوجہد کے لیے پر تول رہا ہے، اور کہتا ہے ۔

نئی منزل کی دشواری مسلم
مگر ہم بھی ہیں دیوانے پرانے

شاعر ظلم و جبر کے سماج کو پھلتا پھولتا دیکھ رہا ہے ۔

قہقہے بے شعور لوگوں کے
کس قدر بار ہیں سماعت پر

ہم نے اس بستی میں جالب
جھوٹ کا اونچا سر دیکھا ہے

پھر کوئی ظلم ہوا، پھر کہیں جبر و استبداد، ناانصافی قہر بن کر ٹوٹے ۔

اٹھتا ہوا چمن سے دھواں دیکھتے چلو
شاخوں پہ رقصِ برق تپاں دیکھتے چلو

لٹتی ہوئی متاع بیاں دیکھتے چلو
کٹتی ہوئی وفا کی زباں دیکھتے چلو
ہر سو فروغ وہم وگماں دیکھتے چلو
مٹتا ہوا یقیں کا نشاں دیکھتے چلو
اپنے سے کچھ کہو نہ پرائے سے کچھ کہو
دل سوزِدل گداز سماں دیکھتے چلو
جلتا ہوا کسی کا نشیمن سرِ چمن
خاطر پہ ہو ہزار گراں دیکھتے چلو

جاگنے والو تابہ سحر خاموش رہو
کل کیا ہوگا، کس کو خبر خاموش رہو
کس نے سحر کے پاؤں میں زنجیریں ڈالیں
ہوجائے گی رات بسر، خاموش رہو

یہ زمانہ تھا فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان کا۔ 1957 میں ''برگِ آوارہ'' آئی۔ 1958 میں ملک میں پہلا مارشل لاء آیا۔ ملکی حالات تو پہلے بھی خراب تھے، جالب وقت کی سب سے بڑی بائیں بازو کی سیاسی جماعت نیشنل عوامی پارٹی میں شامل ہو چکے تھے، گویا ادھر بھی صف بندی ہو چکی تھی، جالب یہ شعر بھی کہہ چکے تھے اور (23) حضرت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے داد بھی لے چکے تھے۔

کوئی تو پرچم لیکر نکلے اپنے گریباں کا جالب
چاروں جانب سناٹا ہے، دیوانے یاد آتے ہیں

ایبڈو کے تحت ملک بھر میں زباں بندی لاگو تھی، کوئی نہ بول سکتا تھا، نہ لکھ سکتا تھا۔ جنرل ایوب بنیادی جمہوریت کے نئے نظام کے تحت اپنی حکومت کو مضبوط کر رہا تھا، کاسہ لیسوں کی کس دور میں کمی رہی ہے۔ لہٰذا یہاں بھی ''قراردادِ پاکستان لاہور 1940 '' کے اسٹیج پر موجود چودھری خلیق الزماں سمیت ایک ہجوم جنرل ایوب کے ساتھ تھا۔ ملک پر ایک سکوت طاری تھا، ایسے میں جنرل

ایوب نے اپنے وزیرِ قانون سے ملک کا ''دستور'' لکھنے کو کہا اور یوں میاں منظور قادر نے ''دستور'' لکھ ڈالا۔ جو 1962 کا دستور کہلایا۔

پورے ملک میں ہنوز سناٹا تھا کہ ایک آواز اس سنّاٹے کو چیرتی ہوئی ابھری، جنرل ایوب کے خود ساختہ دستور کے خلاف بلند ہونے والی پہلی آواز۔

یہ آواز تھی حبیب جالب کی۔

حبیب جالب نے اپنے گریباں کا پرچم فضا میں بلند کرتے ہوئے چاروں اور پھیلے سنّاٹے کو چیرتے ہوئے دیوانہ وار نعرہء مستانہ بلند کیا ۔

ایسے دستور کو، صبحِ بے نُور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

نظم یوں ہے ۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو، صبحِ بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

میں بھی خائف نہیں، تختہء دار سے
میں بھی منصور ہوں، کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

تم نے لُوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمہارا فسوں

چارہ گر دردمندوں کے بنتے ہو کیوں
تم نہیں چارہ گر، کوئی مانے، مگر
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا
پھول شاخوں پہ کھلنے لگے تم کہو
جام رندوں کو ملنے لگے تم کہو
چاک سینوں کے سلنے لگے تم کہو
اس کھلے جھوٹ کو، ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

نظم آئی تو حکمرانی کے نشے میں چور فوجی حکمران کچھ سمجھ ہی نہ سکے، وہ کیا کسی کے بھی وہم وگمان میں نہیں تھا کہ کوئی اس درجہ گستاخ بھی موجود ہے۔ جالب کو اہلِ علم و ادب ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے پہچانتے تھے، فوجی حکمران کیا جانے کہ حبیب جالب کون ہے۔ اب اس نظم کی اشاعت کا مرحلہ، شاعر کو درپیش تھا، مگر سنسر شپ اور پریس آرڈیننس کے تحت کوئی اخبار، کوئی رسالہ اس نظم کو چھاپ ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے غالباً ایک مزدور تنظیم نے اپنے ہفتہ وار نکلنے والے خبرنامہ ٹائپ اخبار جس کا نام شاید ''جمہور'' تھا اس میں دستور نظم شائع کی تھی۔ شاعر اپنی تخلیق کو عوام تک پہنچانے کے لیے بے چین تھا، آیئے جالب سے سنتے ہیں کہ دستور انہوں نے پہلی بار کہاں پڑھی:

(23) ''یہ مارشل کا خوفناک زمانہ تھا، اس وقت میں نے اپنی مشہور نظم کہی تھی ''دستور۔'' 1962 کا دستور ہم پر مسلط کیا گیا تھا۔ یہ نظم اسی کے بارے میں تھی۔ اب اس کو پڑھنے کا معاملہ تھا کہ اس کو پڑھا کہاں جائے؟ اتفاق سے ایک مشاعرہ آ گیا۔ یہ مشاعرہ مری میں تھا۔ جشنِ مری مشاعرہ جہاں پاکستان کے شاعروں کی ''کریم'' اکٹھی تھی۔ سب وہاں موجود تھے۔ اس زمانے میں منظور قادر وزیر قانون ہوا کرتے تھے، بہت سے وزراء بھی مشاعرے میں موجود تھے۔ شاعروں میں عموماً ''یہ ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو کٹواؤ'' جیسے پتنگوں کے پیچ ہوتے ہیں اور کسی ایک کی

پتنگ کٹ جاتی ہے، اسی طرح مشاعروں میں شاعر کاٹے جاتے تھے کیونکہ شاعر آپس میں حسد رکھتے تھے، کسی کی ''واہ واہ'' ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس زمانے میں تین شاعر بڑے مشہور تھے بلکہ ''مشاعرہ لُوٹ'' قسم کے شاعر تھے۔ سید محمد جعفری، شوکت تھانوی اور ظریف جبل پوری۔ یہ لوگ طنز و مزاح میں شعر کہتے تھے اور لوگ ان کو سن کر بہت خوش ہوتے تھے اور وزراء بھی لطف اندوز ہوتے تھے، یوں حکمران طبقہ بھی ان سے خوش رہتا تھا۔ شوکت تھانوی جب اس مشاعرے میں غالب کی غزل کا ہندی version پیش کر چکا اور غالب کی توہین کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو ہنسا چکا تو ایک شاعر نے ''ناظم مشاعرہ'' شاعر کو اشارہ کیا جس کے معنی تھے کہ اب جالب کو ''کٹواؤ'' میں نے اتفاق سے وہ اشارہ دیکھ لیا، اور میں نے سوچا کہ یہاں غزل نہیں چلے گی اور غزل سنانا بھی نہیں چاہیے تھی کیونکہ جب تین مزاحیہ شاعر اوپر تلے لوگوں کو ہنسا چکے ہیں اور ان پر یہاں کے مارشل لاء اور اس کے مسلط کردہ ''دستور'' کا بھی کوئی اثر نہیں ہے تو پھر میرا فرض بنتا ہے کہ میں یہاں اس کے خلاف برسرِ دربار آواز اٹھاؤں۔ میں مائیک پر آیا اور کہا ''حضرات آج خلافِ معمول میں نظم پیش کروں گا اور نظم کا عنوان ہے ''دستور'' جب میں نے ''دستور'' کہا تو وہی ناظم مشاعرہ مجھے روکنے لگا اس نے میرے پجامے کا پائنچہ پکڑ کر کھینچا اور بولا ''کیا کر رہے ہو'' ''کیا کر رہے ہو'' میں نے کہا کہ ''اب ہٹ جاؤ'' مائیک کی تلوار میرے ہاتھ میں تھی اور میں نے سوچا کہ آج میں آمریت کو لہولہان کر کے چھوڑوں گا اور یوں میں نے نظم دستور ترنم سے پڑھنا شروع کر دی۔ یہ نظم سننے کے دوران ایوبی آمریت کی وجہ سے جو لوگ سہمے ہوئے بیٹھے تھے، وہ اب نعرہ زن ہو گئے اور با آواز بلند داد دی اور بار بار ایک ایک بند کو سنا، جب میں نظم ختم کر چکا اور اسٹیج سے اترا تو مشاعرہ بھی ختم ہو گیا حالانکہ کچھ شاعر ابھی بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کو کسی نے

نہیں سنا، چلتے چلتے ایک بزرگ نے مجھ سے کہا کہ ''یہ موقع نہیں تھا ایسی نظم پڑھنے کا'' میں نے انہیں جواب دیا کہ ''میں موقع پرست نہیں ہوں۔''

مشاعرے میں جسٹس بشیر احمد بھی تھے انہوں نے کہا ''ابھی نہیں پکڑیں گے آہستہ آہستہ پکڑیں گے۔'' اس نظم کو پڑھنے کے بعد دس سال تک میرا داخلہ مری میں بند ہو گیا اور قید و بند کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ میں ان دنوں پنجاب کے ہر ضلع اور شہر میں ایک بار ضرور گیا اور وہاں جا کر یہ نظم سنائی تھی کوئی ڈی سی مجھ سے نہیں جیت سکا۔ لوگوں نے مجھ سے اس نظم کو سنا اور بار بار سنا۔ میں نے کہا تھا کہ ''یہ جو مشاعرہ پڑھنے کا تین چار سو روپے معاوضہ ہوتا ہے، اس سے کہیں زیادہ قیمتی لوگوں کا جذبہ ہے۔ میں چند روپوں کے لیے لوگوں کے اس جذبے کو مجروح نہیں کر سکتا۔ میں نے لوگوں کے حوصلے بڑھائے اور انہی کا ساتھ دیا۔ مشاعروں کے شاعر بھی میرا پیچھا کرتے رہے میں جہاں بھی جاتا وہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو کہلواتے کہ ''اس کورو کو یہ نظم دستور پڑھے گا۔

''جتنا مجھ پر تارچر ان شاعروں نے کیا ہے، اتنا تو پولیس والوں نے بھی نہیں کیا۔''

1958 میں جالب صاحب، والدین، بیوی، اکلوتی بہن اور چھوٹے بھائی (سعید پرویز) سمیت کراچی سے لاہور منتقل ہوئے۔ جالب صاحب لاہور مستقل رہائش کے خواہش مند تو تھے مگر اس وقت اصل مسئلہ اکلوتی بہن کی شادی کا تھا۔ لاہور آنے کے چند ہی دن بعد آپا رشیدہ کا رشتہ طے ہو گیا۔ ہمارے بہنوئی مختار بھائی بڑے لائق آدمی تھے، انہوں نے میٹرک کے امتحان میں پورے پنجاب بورڈ میں اول پوزیشن حاصل کی تھی اور وہ اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کے دفتر میں ملازم تھے۔ بہن کی شادی کے اخراجات میں نمایاں حصہ جالب بھائی کا تھا۔ 1956 میں جالب صاحب ہندوستان میں مشاعرہ پڑھ کے متعارف ہو چکے تھے۔ 1961 تک ان کو متعدد بار ہندوستان کے مشاعروں میں مدعو کیا گیا۔ لاہور میں بہت بڑے اور اہم فلم سازوں نے بھی جالب صاحب سے اپنی فلموں کے گیت لکھوائے۔ لاہور میں سب سے پہلے جالب صاحب نے جس فلم کے گیت لکھے اس کا نام تھا ''بھروسہ''، اس فلم کے پروڈیوسر ڈائریکٹر جعفر شاہ بخاری تھے۔

اس فلم کے کہانی نویس ریاض شاہد تھے اور ریاض شاہد صاحب کی بھی یہ پہلی فلم تھی۔ (یہی فلم دوبارہ ''سماج'' کے نام سے بھی بنی، اور جعفر شاہ بخاری ہی اس کے بھی پروڈیوسر ڈائریکٹر تھے، دونوں بار فلم کی موسیقی اے حمید کے حصے میں آئی۔) جالب صاحب نے رائج معاوضے سے تین گنا معاوضہ مانگا اور فلم سازوں نے دیا۔ یہ سب آپا رشیدہ کا نصیب تھا۔ ہماری بہن کی رخصتی رام نگر (کرشن نگر اور سنت نگر کے درمیان کا علاقہ) کے ایک مکان سے ہوئی تھی۔ بہن کی شادی کے بعد ہم سانده خورد کے علاقے میں چلے آئے۔ جہاں بیس روپے ماہوار کرائے کے ایک کمرے والے مکان میں ہم نے رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس مکان کا صحن کچا تھا اور سرخ اینٹوں والا اکلوتا کمرہ بغیر پلستر کے تھا۔ مجھے ارجن روڈ کرشن نگر کے کارپوریشن پرائمری اسکول میں پانچویں جماعت میں داخل کروا دیا گیا جہاں ٹیسٹ کرکٹر شفیق پاپا میرا ہم جماعت تھا۔ 1960 میں پانچویں جماعت پاس کر کے میں مسلم ماڈل ہائی اسکول لاہور آ گیا (جہاں سے میں نے 1964 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا) سانده خورد کے بیس روپے والے کرائے کے مکان میں، میں نے ساحر صدیقی کو دیکھا، درمیانہ قد، بھرا بھرا جسم، چہرے پر چھوٹی سی سیاہ داڑھی، افسوس کہ وہ عین جوانی میں انتقال کر گئے مرحوم اس زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ ایک بار مری کے مشاعرے میں گئے، ساحر اور جالب بھائی ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے، رات گئے جالب صاحب ہوٹل پہنچے تو ساحر صدیقی پہلے سے ہی کمرے میں موجود سو رہے تھے، جالب بھائی ان کے ساتھ بستر پر لیٹ گئے۔ جالب بھائی بے خبر تھے، جبکہ ساحر انتقال کر چکے تھے، اور جالب بھائی رات بھر مردہ ساحر صدیقی کے ساتھ لیٹے رہے، یہ بات انہیں صبح پتہ چلی جب وہ سو کر اٹھے۔

چند ماہ اس مکان میں گزارنے کے بعد ہم ظہور اسٹریٹ، سانده خورد میں واقع ''رفیق منزل'' والوں کے کرائے دار بن کر رہنے لگے۔ رفیق منزل ایک عمدہ کوٹھی (ڈبل اسٹور) تھی اس کے پچھواڑے ایک ایک کمرے والے تین کوارٹر بنے ہوئے تھے انہی میں درمیان والے کوارٹر میں ہم نے خاصا عرصہ گزارا۔ اس کا کرایہ تیس (30) روپے ماہوار تھا اب یہ بات تاریخ کا حصہ ہے کہ اسی ایک کمرے والے گھر کے مکین حبیب جالب نے فیلڈ مارشل ایوب خان اور نواب کالا باغ گورنر پنجاب سے ''متھا'' لگا رکھا تھا۔

الیکشن 1964

جنرل ایوب نے اپنے بنائے ہوئے بنیادی جمہوریت کے نظام کے تحت الیکشن کا اعلان کردیا۔ متحدہ اپوزیشن چاہتی تھی کہ کوئی مضبوط صدارتی امیدوار سامنے لایا جائے۔ جالب صاحب کی جماعت نیشنل عوامی پارٹی بھی متحدہ اپوزیشن میں شامل تھی۔ اپوزیشن کے تمام اکابرین متفق تھے کہ محترمہ فاطمہ جناح ہی ایسی شخصیت ہیں جو ایوب خان کا مقابلہ کرسکتی ہیں اور قوم کو مارشل لاء سے نجات دلاسکتی ہیں، جالب کہتے ہیں:

(25) ''ان دنوں باچا خان (خان عبدالغفار خان) میاں محمود علی قصوری کے ہاں لاہور آئے ہوئے تھے۔ وہ ملک سے باہر جارہے تھے انہوں نے بھی قصوری صاحب سے کہا ''صرف اور صرف فاطمہ جناح ہی ایوب خان کا مقابلہ کرسکتی ہیں'' اپوزیشن کے تمام سینئر رہنما محترمہ فاطمہ جناح کے پاس جاچکے تھے اور وہ سبھی کو انکار کرچکی تھی۔ ایسے میں مولانا عبدالحمید خان بھاشانی ڈھاکہ سے کراچی تشریف لائے اور وہ محترمہ فاطمہ جناح کے پاس گئے جالب کہتے ہیں:

(26) ''جب محترمہ فاطمہ جناح نے دیگر رہنماؤں کی طرح مولانا بھاشانی سے بھی معذرت چاہی تو مولانا نے محترمہ فاطمہ جناح سے کہا ''تمہارے بھائی نے ہم کو مسجد سے اٹھایا اور سیاست میں لایا اور ہم نے تمہارے بھائی کے ساتھ مل کر پاکستان بنایا، اب پاکستان خطرے میں ہے اور تم الیکشن میں حصہ نہیں لینا چاہتی تو ٹھیک ہے میں بھی مسجد میں واپس چلا جاتا ہوں'' اور مولانا چل دیے محترمہ فاطمہ

جناح نے مولانا بھاشانی سے کہا ''ٹھہرو ٹھہرو اور پھر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔''

جالب صاحب نظم ''دستور'' کے علاوہ ایک دوسری اہم نظم بھی کہہ چکے تھے ''جمہوریت'' یہ نظم بھی بڑی پر تاثیر اور آمریت کے خلاف عوام کو جگانے اور صف آراء کرنے والی نظم تھی، نظم ملاحظہ کیجئے (اس وقت ملک کی آبادی دس کروڑ تھی) جالب کی یہ نظم بھی عوام میں ''دستور'' کی طرح مقبول تھی۔

جمہوریت

دس کروڑ انسانو زندگی سے بیگانو
صرف چند لوگوں نے حق تمہارا چھینا ہے
خاک ایسے جینے پر یہ بھی کوئی جینا ہے
بے شعور بھی تم کو بے شعور کہتے ہیں
سوچتا ہوں یہ ناداں کس ہوا میں رہتے ہیں
اور یہ قصیدہ گو فکر ہے یہی جن کو
ہاتھ میں علم لے کر تم نہ اٹھ سکو لوگو
کب تلک یہ خاموشی چلتے پھرتے زندانو
دس کروڑ انسانو

یہ ملیں یہ جاگیریں کس کا خون پیتی ہیں
بیرکوں میں یہ فوجیں کس کے بل پہ جیتی ہیں
کس کی محنتوں کا پھل داشتائیں کھاتی ہیں
جھونپڑوں سے رونے کی کیوں صدائیں آتی ہیں
جب شباب پر آکر کھیت لہلہاتا ہے
کس کے نین روتے ہیں کون مسکراتا ہے
کاش تم کبھی سمجھو کاش تم کبھی جانو
دس کروڑ انسانو

علم و فن کے رستے میں لاٹھیوں کی یہ باڑیں
کالجوں کے لڑکوں پر گولیوں کی بوچھاڑیں
یہ کرائے کے غنڈے یادگارِ شب دیکھو
کس قدر بھیانک ہے ظلم کا یہ ڈھب دیکھو
رقصِ آتش و آہن دیکھتے ہی جاؤ گے
دیکھتے ہی جاؤ گے ہوش میں نہ آؤ گے
کب تلک یہ خاموشی اے خموش طوفانو

دس کروڑ انسانو

سینکڑوں حسن ناصر ہیں شکار نفرت کے
صبح و شام لٹتے ہیں قافلے محبت کے
کب سے کالے باغوں نے آدمی کو گھیرا ہے
مشعلیں کرو روشن دور تک اندھیرا ہے
میرے دیس کی دھرتی پیار کو ترستی ہے
پتھروں کی بارش ہی اس پہ کیوں برستی ہے
ملک کو بچاؤ بھی ملک کے نگہبانو

دس کروڑ انسانو

بولنے پہ پابندی سوچنے پہ تعزیریں
پاؤں میں غلامی کی آج بھی ہیں زنجیریں
آج حرفِ آخر ہے بات چند لوگوں کی
دن ہے چند لوگوں کا رات چند لوگوں کی
اٹھ کے درد مندوں کے صبح و شام بدلو بھی
جس میں تم نہیں شامل وہ نظام بدلو بھی
دوستوں کو پہچانو دشمنوں کو پہچانو

دس کروڑ انسانو

کراچی کے نشتر پارک میں متحدہ اپوزیشن کا جلسہ تھا محترمہ فاطمہ جناح جلسے کی صدارت کر رہی تھیں، وہاں جالب صاحب نے ''دستور'' اور ''جمہوریت'' پڑھ کر آگ لگا دی، ہر سو شعلے بھڑکنے لگے، اور پھر نشتر پارک کے شعلوں نے پورے شہر کراچی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ متحدہ اپوزیشن نے ''جالب اور عوام'' کا یہ مظاہرہ دیکھا تو اپنے اعلیٰ اجلاس میں فیصلہ کیا کہ حبیب جالب محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ پورے ملک کا انتخابی دورہ کریں گے۔

کراچی کے جلسہ کے بعد جنرل ایوب کی حکومت کو بھی جھرجھری سی آئی اور حکمرانوں کے کان کھڑے ہوئے اور پھر حکمرانوں نے فیصلہ کیا ''جالب کو روکو'' ''اس طوفان کو روکو۔'' ادھر لاہور میں بھی خبریں پہنچ چکی تھی۔ ''دستور'' کے خالق میاں منظور قادر تک بھی رپورٹ پہنچی تو انہوں نے اپنے دوست ملک غلام جیلانی (عاصمہ جہانگیر کے والد) کو فون کیا۔ رات کے دس بج چکے تھے، میاں منظور قادر فون پر کہہ رہے تھے ''ملک صاحب جلد آؤ'' ملک جیلانی میاں صاحب کے پریشان لہجے پر خود بھی پریشان ہو گئے اور پوچھا ''خیریت ہے؟'' جواباً میاں صاحب نے کہا ''بس آپ جلدی آجائیں۔'' ملک صاحب جیسے تیسے میاں منظور قادر کی کوٹھی پہنچے تو دیکھا کہ میاں صاحب لان میں سر جھکائے ٹہل رہے ہیں۔ ملک صاحب نے پوچھا ''میاں صاحب کیا ہوا، خیریت ہے'' تو منظور قادر بولے ''بس اب ہمارا ''دستور'' چلتا نظر نہیں آرہا'' ملک صاحب اب بھی پریشان اور بات کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ ''ہوا کیا ہے؟'' ملک صاحب نے زور دے کر پوچھا وہ ایک نوجوان شاعر حبیب جالب جب کہتا ہے ''ایسے دستور کو، صبح بے نور کو۔ میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا'' تو اس کے ساتھ لاکھوں لوگ مل کر یہی کہتے ہیں، نہیں ملک صاحب نہیں اب ہمیں اپنا دستور چلتا نظر نہیں آرہا ہے۔''

کراچی کے بعد لاہور کے تاریخی موچی گیٹ پر محترمہ فاطمہ جناح کا جلسہ طے تھا۔ شہر بھر کی دیواروں پر جہازی سائز کے پوسٹر چسپاں تھے۔ جن پر جلی حروف میں لکھا تھا ''حبیب جالب اپنی نظم ''دستور'' پیش کریں گے''

پورے لاہور شہر کی پولیس کو گویا Red-Alert کر دیا گیا تھا۔ جنرل صاحب کا حکم تھا اور گورنر نواب امیر محمد خان آف کالا باغ کے بھی احکامات تھے کہ ''حبیب جالب کو پکڑو۔'' پولیس ہمارے ضعیف والد کو تنگ کر رہی تھی۔ جو لاہور کی مضافاتی بستی سانده خورد کے ایک کمرے کے گھر میں تنہا رہ رہے تھے۔ ادھر متحدہ اپوزیشن بھی چوکنا تھی۔ لہٰذا میاں محمود علی قصوری صاحب کو ذمہ داری سونپی گئی کہ حبیب جالب کو گرفتاری سے بچانا ہے۔

میاں محمود علی قصوری صاحب نے اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے جالب صاحب کو قصور میں اپنے آبائی گھر میں چھپا دیا۔ دو تین افراد جالب کی ''دیکھ بھال'' پر لگائے اور ان سے کہا کہ ''آپ یہاں آرام سے رہیں آپ کو ہم خود ہی یہاں سے جلسہ میں لے جائیں گے۔'' آپ نے یہاں سے باہر ہرگز نہیں نکلنا۔'' ادھر لاہور شہر میں محترمہ فاطمہ جناح کے جلسے کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ اور پولیس والے بھی جالب کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ادھر قصور میں جالب نے ایک دن اور رات تو کسی طرح گزارے۔ مگر ''اپنوں کی قید'' انہیں سمجھ میں نہ آئی اور وہ قصور سے بس میں بیٹھ کر لاہور آگئے والد سے ملے درزی سے کُرتا پجامہ لیا اور پھر سیدھے اپنے ٹھکانے ''کافی ہاؤس'' پہنچ گئے عین اسی وقت گورنر ہاؤس میں نواب کالا باغ صاحب کے سامنے لاہور کا سپرنٹنڈنٹ پولیس کھڑا کانپ رہا تھا اور گورنر صاحب گرج رہے تھے ''اوئے تم سے ایک شاعر نہیں پکڑا جاتا'' تم کو معلوم ہے صدر صاحب کو رات کو نیند نہیں آتی'' اوئے جاؤ، دفا ہو جائے اور اگر آج شام تک وہ شاعر نہیں پکڑا گیا تم سب کی پیٹی اتروا دوں گا جاؤ اسے پکڑو''

''کافی ہاؤس'' میں گہما گہمی تھی۔ جالب داخل ہوئے تو ان کے ساتھی ان کی طرف لپکے۔ (وہ جس ٹیبل پر بیٹھے وہاں (27) مولانا حسن ہاشمی، صوفی عبدالغفار اور لائل پور (حال فیصل آباد) کے دو طالب علم شمیم احمد اور زاہد عکاسی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے، حسن ہاشمی اور صوفی غفار نیشنل عوامی پارٹی کے ممبر تھے جبکہ شمیم احمد اور زاہد عکاسی طالب علم اور جالب کے نظریاتی ساتھی تھے اور بعد کو بھٹو صاحب کے دور میں مرحوم شمیم احمد پنجاب اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر بھی بنے البتہ زاہد عکاسی

آج بھی بقیدِ حیات ہیں اور لاہور میں مقیم ہیں۔(یہ نام میں نے 1964 کے اخبارات کے تراشوں سے لیے ہیں جنہیں میں نے آج تک سنبھال کے رکھا ہوا ہے اور دو سال قبل شائع ہونے والی میری ضخیم کتاب (بارہ سو صفحات) ''حبیب جالب۔ میں طلوع ہو رہا ہوں'' میں بھی ان اخباری تراشوں کا عکس شامل ہے۔ یہ چاروں احباب حبیب جالب کے گواہ کے طور پر بھی عدالتوں میں پیش ہوئے تھے)

''کافی ہاؤس'' کا منیجر پولیس کا مخبر تھا اس نے جالب صاحب کو دیکھا تو فوراً تھانہ پرانی انار کلی فون کر دیا کہ ''حبیب جالب کافی ہاؤس میں ہے'' اور پھر کچھ دیر بعد پولیس کے لوگ سادہ لباس میں جالب کی ٹیبل کے گرد موجود تھے۔

جالب صاحب! ''آپ سے کچھ بات کرنا ہے'' سادہ لباس شخص جالب سے مخاطب تھا جالب نے غور سے اس شخص کو دیکھا۔ یقیناً جالب سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے اس شخص سے کہا ''کیا بات کرنا ہے، بولو'' وہ شخص بولا ''ذرا تنہائی میں بات کرنا ہے'' جالب نے درشت لہجے میں کہا ''تنہائی میں کیا بات کرنا ہے، وارنٹ گرفتاری ہیں تو دکھاؤ'' وہ شخص مسکرایا اور بولا ''بس جالب صاحب ذرا آپ کا پاسپورٹ دیکھنا ہے'' اور پھر سادہ لباس تین بندے جالب کو باتوں میں لگا کر کافی ہاؤس سے باہر لے گئے۔ جالب کے ساتھی بھی باہر آ گئے۔ جہاں پولیس کی جیپ کھڑی تھی اور پولیس والوں نے زبردستی اٹھا کر جالب صاحب کو جیپ میں ڈالا اور روانہ ہو گئے۔

جالب کے ساتھی شمیم احمد، زاہد عکاسی و دیگر میاں محمود علی قصوری کے دفتر پہنچے اور انہیں جالب کی گرفتاری سے آگاہ کیا۔ میاں صاحب سن کر بہت پریشان ہوئے اور پھر انہوں نے فون پر تھانہ پرانی انار کلی والوں سے پوچھا ''جالب کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے'' وہاں سے انہیں جواب ملا کہ ہم نے تو گرفتار ہی نہیں کیا۔ نہ ہمیں جالب صاحب کے بارے میں کچھ علم ہے۔ میاں محمود علی قصوری نے ڈپٹی کمشنر لاہور اور متعلقہ کئی تھانوں سے پوچھا مگر کوئی نہیں بتا رہا تھا کہ جالب کہاں ہے اور اسے کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ جالب پر کیا بیتی، جالب سے سنتے ہیں:

(28) ''چھ سات غنڈہ ٹائپ پولیس والے تھے انہوں نے مجھے پکڑ کر جیپ میں ڈالا ،راستے میں جیپ لاء کالج کے پاس رکی۔ وہاں سے انہوں نے ''پولیس ڈاکٹر'' سے سرٹیفکیٹ لیا کہ ''میں نے شراب پی رکھی ہے'' میں یہ سب کارروائی دیکھ رہا تھا۔ لوگوں کو اور میرے ساتھیوں کو میری گرفتاری کے بارے میں پتہ چل گیا تھا مگر پولیس والوں نے انہیں میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ اب میرے علاقے کے اس تھانیدار کا انتظار ہو رہا تھا کہ جس کی ڈیوٹی مجھے گرفتار کرنے کی تھی، اور پھر وہ تھانیدار آ گیا سب پولیس والے اشاروں میں بات کر رہے تھے، دراصل وہ اس شش و پنج میں مبتلا تھے کہ مجھ پر کون سا کیس ڈالیں اور کس طرح مجھے ''مجرم'' ثابت کریں۔ میں نے ان سے کہا ''میرا پاسپورٹ دیکھ لو اور مجھے فارغ کرو'' اب پولیس والے پاسپورٹ دیکھ رہے ہیں اور میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ پاسپورٹ کو جعلی نہیں بنا سکتے تھے۔ جو بھی نشان لگاتے صاف پتہ چل جاتا تھا اور کیس بھی مضبوط نہیں بنتا تھا بلکہ سرے سے مقدمہ ہی الٹ ہو جانا تھا۔ میرے علاقے کا تھانیدار بہت پریشان تھا۔ اس کے ساتھ دو ڈی ایس پی بھی تھے اور ساحل فارانی نامی کسی شاعر کو بھی انہوں نے میرے ساتھ لٹکایا ہوا تھا۔ اس کے ذمے انہوں نے یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ اس نے مجھے گرفتار کروانا ہے۔ وہ بیچارہ سخت مصیبت میں گرفتار تھا پولیس اسے ساتھ لے کر کبھی میرے گھر جاتی، کبھی کسی جلسے میں جاتی لیکن فارانی کو میں کہیں نظر نہ آیا اور وہ مجھے ''برآمد'' نہ کرا سکا۔ فارانی نے بعد میں مجھے یہ تفصیل بتائی تھی اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ''میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ آپ میری وجہ سے گرفتار نہیں ہوئے ورنہ اپنے دامن پر لگا یہ داغ میں عمر بھر نہ دھو سکتا تھا۔''

بہرحال پولیس تفتیش کر رہی تھی اور اپنی تمام عقل استعمال کر رہی تھی کہ مجھ پر کوئی جرم ڈال کر ''مقدمہ'' مضبوط بنایا جا سکے۔ میں نے ایک پولیس والے سے پوچھا کہ

''تم لوگ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے ہو؟'' تو اس نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا ''ہم پہلے ٹانگیں توڑیں گے پھر بانہیں توڑیں گے پھر پیش کریں گے'' میں نے کہا ''پاسپورٹ تو دیکھ لیا اب اور کیا دیکھنا ہے اب مجھے جانے دو'' ایک اے ایس آئی تھا جو بعد میں ایس پی ہو گیا اس کا نام فاروقی تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ''میں نے آپ کو اکثر کالجوں میں سنا ہے، میں آپ کا مداح ہوں مگر آپ تو ہماری وردیاں اتروانے لگے تھے اور ہماری ملازمت ختم کروانے لگے تھے، گورنر کالا باغ صاحب کا آرڈر تھا کہ اگر آج حبیب جالب کو نہ پکڑا تو سب کو معطل کر دیا جائے گا۔ لہٰذا آپ بیٹھ جائیں اور اب ہم آپ کو نہیں چھوڑیں گے ہم نے آپ کو پکڑ لیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا ''اب آگے کیا پروگرام ہے'' کہنے لگا کہ ''اب آپ جیل جائیں گے، کچھ پھل وغیرہ منگوائیں آپ کے لیے یا کھانا منگوائیں؟ جو آپ کہیں وہ آ جائے گا'' میں اس کی ''مجبوریاں'' سمجھ رہا تھا میں نے اس سے کہا ''نجانے تم لوگوں نے کیا کیا ''برآمد'' کر لیا ہے، کچھ مجھے بھی بتاؤ۔''

بالآخر وہ مجھے ایک مجسٹریٹ انور لطیف کے پاس لے گئے وہ بھی مجھے جانتے تھے۔ مجھ پر جو جھوٹا مقدمہ بنایا گیا، وہ یوں تھا کہ ''ایک شخص محمد وارث کے میں نے ایک ہزار روپے دینے تھے اس نے اپنے پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کیا، میری اس سے تکرار ہوئی جو بڑھتی چلی گئی اور پھر میں نے اپنے تھیلے سے چاقو نکالا اور اس کو زخمی کر دیا اور مجھے عین موقع پر پولیس نے چاقو سمیت پکڑ لیا۔ موقع کے گواہ بھی موجود تھے۔ جنہوں نے یہ سارا قصہ دیکھا اور مزید یہ کہ میری تلاشی کے دوران میرے تھیلے سے شراب کی دو بھری ہوئی بوتلیں بھی برآمد ہوئیں۔ پولیس نے مجھ پر اکٹھے تین مقدمے بنا لیے تھے تا کہ میں کسی بھی طرح ان کے چنگل سے نہ نکل سکوں۔ وہاں انہوں نے ''خون آلود قمیص'' بھی دکھائی، میں یہ سب ڈرامہ دیکھ کر

پریشان ہوگیا کہ یہ سب کیا ہے اور سوچنے لگا کہ ''یہ سب کہیں ہوتو نہیں گیا۔''
بہر حال پولیس نے یہ سب کچھ بنا کر مجھے رگڑ ادے دیا اور جیل میں ڈال دیا کیونکہ یہ
نواب آف کالا باغ کا حکم تھا۔

پولیس اسٹیشن میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل شوکت محمود بھی آئے، وہ مجھے لائل پور (فیصل آباد) سے جانتے تھے کہنے لگے ''ہاں ہاں میں جانتا ہوں' یہ بڑا چاقو باز قسم کا شاعر ہے اور مجھ سے بھی باتیں کرنے لگے ''تم نے کیا حکومت کے خلاف لکھ دیا'' جب پولیس والے ادھر ادھر ہو گئے تو مجھ سے کہا ''شاباش بیٹے۔'' وہ دراصل سب سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایک بہت ہی صاف ستھرے قیدی کو جس کا نام آصف تھا میرے ساتھ مامور کر دیا وہ کسی قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور ایک بڑی سی بیرک کے صاف ستھرے گوشے میں مجھے پہنچا دیا۔

جیل میں قسم قسم کے قیدی موجود تھے ان لوگوں سے آشنائی ہوئی تو وہ روزانہ مجھ سے نظمیں غزلیں سنا کرتے اور میں ان کی فرمائش پر اپنی شاعری سنایا کرتا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کو پتہ چلا تو انہوں نے مجھ سے کہا ''بھئی ہماری رپورٹ ہو جائے گی تم یہ کام چھوڑ دو'' مگر قیدی مجھ سے کلام سننے پر مصر رہتے۔ لہٰذا جیلر صاحب نے شاعری کے لیے ایک گھنٹہ مخصوص کر دیا۔ بہر کیف یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اسی اثنا میں محمود علی قصوری ہماری ضمانت کے لیے لوئر کورٹ چلے گئے جہاں وہ جایا نہیں کرتے تھے، لوئر کورٹ سے ضمانت مسترد ہو گئی پھر سیشن کورٹ سے بھی ضمانت مسترد ہو گئی پھر ہائی کورٹ میں آئے اور حکومت کے پلان کے مطابق ان جلسوں کے دن گزر گئے جن میں مجھے شامل ہونا تھا۔ مگر ان جلسوں میں میری ٹیپ شدہ نظم ''دستور'' سنائی جاتی تھی اور لوگ والہانہ حبیب جالب زندہ باد کے نعرے بلند کرتے تھے۔

اس واقعے کے مدتوں بعد عوامی حقوق کی جنگ لڑتے ہوئے میں جیل گیا تو وہاں

میری ملاقات اسی محمد وارث سے ہوئی جس نے میرے خلاف جھوٹا مقدمہ بنوایا تھا۔ وارث کسی جرم کی سزا میں جیل آیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے معافی مانگی اور کہا ''آپ کے خلاف حکومت کے دباؤ میں آ کر میں نے ایسا کیا تھا'' میں نے اس سے کہا ''چھوڑ دو بھائی ہم سب اس دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں'' وارث نے تقریباً بیس پچیس برس بعد 1989 میں روزنامہ مشرق میں ایک بیان دیا کہ ''میرے سینے پر ایک بوجھ ہے اور میں کھلے عام اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے حبیب جالب پر جھوٹا مقدمہ بنوایا تھا۔''

میں نے مجسٹریٹ مسٹر انور لطیف کے سامنے بیان دیا کہ ''میں حزب اختلاف کے جلسوں میں نظمیں پڑھتا تھا اور یہ بات حکومت کے لیے پریشانی کا باعث تھی لہٰذا مجھے گرفتار کر کے یہ جھوٹا مقدمہ میرے خلاف قائم کیا گیا ہے۔'' میں نے عدالت کے کٹہرے میں اپنے کردار کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''میں نیشنل عوامی پارٹی کی صوبائی کونسل کا رکن ہوں، میں گزشتہ برس سے حزبِ اختلاف کے جلسوں میں اپنی دو نظمیں ''جمہوریت'' اور ''دستور'' پڑھا کرتا تھا۔ میں ملک میں مکمل جمہوریت کا حامی ہوں۔ اس جھوٹے مقدمے سے پندرہ روز قبل کراچی کے جلسوں میں یہ نظمیں پڑھی گئیں اور عوام نے انہیں بے حد پسند کیا۔ حکومت اس صورتِ حال سے پریشان تھی۔ اور مجھ پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ میں یہ نظمیں جلسوں میں نہ پڑھوں۔ اس بارے میں 29 راگست 1964 کو میں نے شیزان ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس کی جس میں پولیس کے رویے پر روشنی ڈالی تھی۔

میری ضمانت کی درخواست کی پیروی کے لیے میاں محمود علی قصوری، اعجاز حسین بٹالوی، بیرسٹر ایم انور، عابد حسن منٹو، ملک حامد سرفراز اور متعدد وکلا نے اپنی خدمات مفت پیش کی تھیں مگر میرے مقدمے کی پیروی میں میاں محمود علی قصوری اور ان کے اسسٹنٹ شیخ رفیق احمد زیادہ نمایاں تھے۔ وکلاء سارا سارا دن عدالت میں حاضر

رہتے اور قانونی نکات پر مغز کھپاتے تھے۔ میرے سیاسی وادبی رفقائے کار، اہلِ خاندان اور عوام سب یہ چاہتے تھے کہ میں رہا ہو جاؤں، اس سلسلے میں پر خلوص کوششیں بھی جاری تھیں۔ جوں جوں میری قید کا عرصہ طویل ہوتا گیا، عوام میں حکومت کے خلاف مزید نفرت پیدا ہونے لگی۔ میرے اہلِ خانہ یوں بھی پریشان تھے کہ میں ان کا واحد کفیل تھا۔

جب حکومت نے یہ محسوس کیا کہ میرے وکلاء کے ٹھوس دلائل سے میری ضمانت ہو جائے گی تو اس نے میرے خلاف ایک اور چال چل دی اور عدالت میں ایک جھوٹے گواہ منیر احمد کتب فروش کو پیش کر دیا جس نے حلف اٹھا کر یہ بیان قلم بند کروایا کہ ''ملزم حبیب جالب نے میرے سامنے چاقو سے محمد وارث پر وار کیے'' اس بیان پر میرے وکیل نے جرح کی اور گواہ اور محمد وارث کی دوستی کا ثبوت پیش کیا۔ دراصل حکومت کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ میری شاعری نے عوام میں حکومت کے خلاف نفرت کو بھڑکا دیا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی مادرِ ملت کے تین بڑے جلسے ہو گئے تو میری ضمانت بھی منظور ہو گئی۔

میں جیل میں ہی تھا کہ مجھے سزا کے طور پر ''قصوری چکی'' میں ڈال دیا گیا۔ مجھ پر الزام تھا کہ میں یہاں قیدیوں کو شعر سناتا ہوں۔ جیل کی ایک بیرک میں عبدالصمد اچکزئی اکیلے رہتے تھے۔ وہ صبح مجھے ناشتہ دینے آتے تھے ایک دو دن تو انہیں آنے دیا گیا لیکن پھر انہیں روک دیا گیا۔ جیل کے قیدی مجھ سے پوچھتے تھے کہ ''آپ یہاں کیسے آئے کون سا جرم کیا ہے'' میں ان سے کہتا ''شاعری کی وجہ سے آیا ہوں'' وہ پوچھتے ''کون سی شاعری، ہمیں بھی سنائیں'' جب میں نے انہیں اپنی شاعری سنائی تو وہ بولے ''پھر تو آپ ٹھیک ہی یہاں آئے ہیں'' ایسی شاعری پر تو جیل ہی ہو سکتی ہے'' وہاں پر بھی میں لوگوں کے حوصلے بلند کرتا تھا اور ان سے کہا کرتا تھا کہ

''ادھر اچھے کاموں کی وجہ سے آؤ گے تو لوگ سواگت کریں گے، احترام کریں گے، آپ جو اس وقت ڈرے ڈرے سے سہمے سہمے سے رہتے ہو، ہر وقت یہی دعا کرتے ہو، کہ خدایا ہمیں یہاں سے باہر نکال، جبکہ میں تو خدا سے یہی دعا کرتا ہوں کہ بندوں کے حقوق کے لیے مجھے بار بار یہاں آنا پڑے تو میں آؤں گا۔ اس لیے میں قطعی خوف زدہ نہیں گھبرایا ہوا نہیں۔'' وہ کہتے ''پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں'' میں ان سے کہتا ''سیدھی بات ہے تم لوگوں کو تنگ کرتے ہو، اس لیے یہاں سزا پا رہے ہو، اگر تم حقوق انسانی کے لیے جنگ لڑتے ہوئے جیل آؤ گے تو ہیرو کہلاؤ گے، نام اور عزت پاؤ گے'' ان کی سمجھ میں بمشکل یہ بات آتی۔ مگر وہ سب مجھ سے روزانہ میری شاعری اور میری باتیں سنتے تھے۔

جب مادرِ ملت کے تینوں بڑے جلسے لاہور، پنڈی اور پشاور میں ہو چکے تو میری ضمانت کا کیس بھی ہائی کورٹ میں لگ گیا۔ جسٹس عبدالعزیز خان ہوتے تھے۔ میاں محمود علی قصوری نے میری ضمانت کے کیس میں بڑی محنت کی۔ وہ کیس کو لے کر لوئر کورٹس سے چل رہے تھے۔ انہوں نے ہائی کورٹ میں بھی دلائل پیش کیے اور یہ بھی کہا ''میں جالب اور اس کے پورے خاندان سے اچھی طرح واقف ہوں یہ تو کسی کو آنکھ نہیں مار سکتا چاقو کہاں سے مارے گا۔''

بہر کیف ہائی کورٹ سے میری ضمانت ہو گئی۔ جس روز ضمانت ہوئی اس روز لارنس گارڈن لاہور میں محترمہ فاطمہ جناح کے اعزاز میں لاہور کے شہریوں کی جانب سے استقبالیہ دیا جا رہا تھا۔ قصوری صاحب مجھے جیل سے سیدھے لارنس گارڈن لے گئے۔ وہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے، انہوں نے مجھے دیکھ کر تالیاں بجائیں اور نعرہ زن ہوئے اور میرا یہ عالم تھا کہ لوگوں کی اپنے لیے محبت اور چاہت دیکھ کر میں حیرت زدہ تھا اور خوش بھی تھا۔ اسٹیج پر مادرِ ملت بیٹھی تھیں، متحدہ

حزبِ اختلاف کے صفِ اول کے اکابرین بھی موجود تھے۔ مجھے اسٹیج پر چڑھا دیا گیا اور لوگوں نے مجھ سے نظم سنانے کے لیے نعرے لگائے۔ میں نے مائیک پر آ کے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں جیل سے ایوب خان کا قصیدہ لکھ کر لایا ہوں جس نے مجھے یہ عزت بخشی، شہرت بخشی، جو آج مجھے یہ مقام ملا ہے۔ اس کے صلے میں، میں نے ایوب خان کا قصیدہ لکھا ہے جو آپ کو سناتا ہوں۔ اور میں نے شروع میں کئی بار یہی مصرعہ دہرایا ''صدر ایوب زندہ باد' صدر ایوب زندہ باد'' لوگ بار بار یہ سن کر پریشان ہو گئے اور سمجھے کہ جالب پر بڑا تشدد ہوا ہے اور وہ ڈر گیا ہے اور یہ کہ وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ بہر حال میں نے جب نظم آگے بڑھائی تو لوگوں کو اطمینان ہوا اور انہوں نے میرے حق میں نعرے بلند کیے۔ نظم یہ تھی ۔

بیس گھرانے

بیس گھرانے ہیں آباد اور کروڑوں ہیں ناشاد

صدر ایوب زندہ باد

آج بھی ہم پر جاری ہے کالی صدیوں کی بے داد

صدر ایوب زندہ باد

بیس روپیہ من آٹا اس پر بھی ہے سناٹا

گوہر، سہگل، آدم جی بنے ہیں برلا اور ٹاٹا

ملک کے دشمن کہلاتے ہیں جب ہم کرتے ہیں فریاد

صدر ایوب زندہ باد

لائسنسوں کا موسم ہے کنونشن کو کیا غم ہے

آج حکومت کے در پر ہر شاہیں کا سر خم ہے

درسِ خودی دینے والوں کو بھول گئی اقبال کی یاد

صدر ایوب زندہ باد

عام ہوئی غنڈہ گردی چپ ہیں سپاہی باوردی
شمعِ نوائے اہلِ سخن "کالے باغ" نے گل کردی
اہل قفس کی قید بڑھا کر کم کرلی اپنی میعاد
صدرایوب زندہ باد

یہ میثاقِ استنبول کیا کھولوں میں اس کا پول
بجتا رہے گا محلوں میں کب تک یہ بے ہنگم ڈھول
سارے عرب ناراض ہوئے ہیں سیٹو اور سینٹو ہیں شاد
صدرایوب زندہ باد

گلی گلی میں جنگ ہوئی خلقت دیکھ کے دنگ ہوئی
اہلِ نظر کی ہر بستی جیل کے ہاتھوں تنگ ہوئی
وہ دستور ہمیں بخشا ہے نفرت ہے جس کی بنیاد
صدرایوب زندہ باد

ــــ: جنرل ایوب کی سیاسی جماعت کنونشن مسلم لیگ

نظم مشیر کا واقعہ

نظم ''مشیر'' بھی حبیب جالب کی نظموں میں ایک اہم نظم ہے۔ اس نظم کی شانِ نزول، حبیب جالب ہی سے سنیئے:

(29) ''ایک دفعہ حفیظ جالندھری کچہری بازار لائل پور میں ملے۔ میں نے سلام عرض کیا۔ انہوں نے کہا ''جلدی جلدی بات کر لے، میں بہت مصروف ہوں'' میں نے پوچھا ''حضور کیا مصروفیت ہے؟'' جواباً انہوں نے شہادت کی انگلی سے اوپر آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا ''میں اس کا مشیر ہو گیا ہوں'' میں نے کہا ''کیا آپ خدا کے مشیر ہو گئے ہیں''؟ تو وہ بولے ''فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا مشیر ہو گیا ہوں، وہ کسی بھی وقت مجھے بلا لیتے ہیں، رات کو، دن کو، اور مجھ سے پوچھتے ہیں ''حفیظ! بتاؤ میں کیا کروں۔'' تو میں ایوب خان سے عرض کرتا ہوں کہ ''مسلمان ڈنڈے کا ہی گاہک ہے، اس پر ڈنڈا رکھ اور یہ جو وکلاء قانون کے عمل درآمد کی بات کرتے ہیں، ان کو بھی سخت سزا دے اور یہ جو طالب علم یونیورسٹی آرڈیننس کے خلاف جلوس نکالتے ہیں، ان کو بھی پکڑ اور اندر ڈال، یہ سب ڈنڈے کے گاہک ہیں اور یہ جو شاعر کہتا پھرتا ہے ''میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا،، اس کو بھی پکڑ اور اندر ڈال۔''

حفیظ جالندھری صاحب جب یہ سب فرما رہے تھے تو ایک نظم کا خاکہ میرے ذہن میں بن گیا اور میں نے نظم کہہ ڈالی جس کا نام میں نے ''مشیر'' رکھا۔ نظم ملاحظہ کیجئے۔

مشیر

میں نے اُس سے یہ کہا
یہ جو دس کروڑ ہیں
جہل کا نچوڑ ہیں
ان کی فکر سوگئی
ہر امید کی کرن
ظلمتوں میں کھوگئی

یہ خبر درست ہے
ان کی موت ہوگئی
بے شعور لوگ ہیں
زندگی کا روگ ہیں
اور تیرے پاس ہے
ان کے درد کی دوا
میں نے اس سے یہ کہا

تو خُدا کا نُور ہے
عقل ہے شعور ہے
قوم تیرے ساتھ ہے
تیرے ہی وجود سے
ملک کی نجات ہے
تو ہے مہرِ صبحِ نو
تیرے بعد رات ہے
بولتے جو چند ہیں
سب یہ شرپسند ہیں
ان کی کھینچ لے زباں
ان کا گھونٹ دے گلا
میں نے اس سے یہ کہا

سوائے سہروردی کے کسی نے "ایبڈو" کا کیس نہیں لڑا۔ تمام سیاست دان چپ ہو گئے تھے، سرنگوں ہو گئے تھے، تو میں نے اسی طرف نظم میں اشارہ کیا ہے ۔

جن کو تھا زباں پہ ناز
چپ ہیں وہ زباں دراز
چین ہے سماج میں
بے مثال فرق ہے
کل میں اور آج میں
اپنے خرچ پر ہیں قید
لوگ تیرے راج میں
آدمی ہے وہ بڑا
در پہ جو رہے پڑا
جو پناہ مانگ لے
اس کی بخش دے خطا
میں نے اس سے یہ کہا
ہر وزیر، ہر سفیر
بے نظیر ہے مشیر
واہ کیا جواب ہے
تیرے ذہن کی قسم
خوب انتخاب ہے
جاگتی ہے افسری
قوم محوِ خواب ہے
یہ ترا "وحید خاں"
دے رہا ہے جو بیاں
پڑھ کے اس کو ہر کوئی
کہہ رہا ہے مرحبا
میں نے اس سے یہ کہا

چین اپنا یار ہے
اس پہ جاں نثار ہے
پر وہاں ہے جو نظام
اس طرف نہ جائیو
اس کو دور سے سلام
دس کروڑ یہ گدھے
جن کا نام ہے عوام
کیا بنیں گے حکمران
تُو یقین ہے، یہ گمان
اپنی تو دعاء ہے یہ
صدر تو رہے سَدا
میں نے اس سے یہ کہا

یہ نظم جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ مجھے حفیظ جالندھری نے ہی عطا کی تھی، ان کی گفتگو سے میں نے یہ نظم اخذ کی تھی۔ یہ ایسے شاعر تھے کہ جو حکمرانوں کے دربار سے وابستہ تھے۔ اور آمروں کے خیر خواہ تھے جبکہ دوسری جانب تاریخ میں وہ شاعر بھی گزرے ہیں کہ جنہوں نے جھومتے ہوئے پھانسی کے پھندوں کو چوما ہے۔ انہوں نے آمریت اور شہنشاہیت کے خلاف شاعری کی ہے۔ ایران میں پہلوی دور کے شاعر تھے اور یہ سلسلہ ہندوسان کے حسرت موہانی سے، مخدوم محی الدین تک آتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے بھی انگریز سامراج کے خلاف جنگ لڑی تھی، ان کا بھی ایک بڑا کردار ہے، اور وہ ایک بے بدل صحافی بھی تھے اور ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ اس زمانے میں علامہ اقبال کہیں نظر نہیں آتے۔

پاکستان میں بھی سیاسی تحریکیں چلیں۔ شعراء اور ادباء مراعات یافتہ ہوتے گئے اور میں تنہا ''موچی گیٹ'' پر آمریت کے خلاف نظمیں پڑھتا رہا۔ مادرِ ملت کی انتخابی مہم جاری تھی، اس دوران مجھے یاد ہے کہ ایک سی ایس پی آفیسر اصغر نامی میرے پاس گھر آیا اور کہنے لگا ''زمین لے

لو، لائسنس لے لو، روپیہ پیسہ جتنا مرضی لے لو، آپ مادرِ ملت کا دست و بازو نہ بنیں، ان کو چھوڑ دیں، اور نہ ہی ہمارے حق میں لکھیں، آپ ہسپتال میں داخل ہو جائیں اور کہیں کہ میں بیمار ہوں، آپ کی عزت نفس بھی مجروح نہیں ہو گی" میں نے اسے جواب دیا "یہ تمام باتیں ہی غلط ہیں، میرے مزاج اور ضمیر کے خلاف ہیں اور میں جو کر رہا ہوں وہی کروں گا" میں نے حکومت کی پیشکش ٹھکرا دی (پیشکشوں کا یہ سلسلہ بعد کی حکومتوں کی طرف سے بھی جاری رہا) اور میں نے مادرِ ملت کا ساتھ دیا اور ان کے ساتھ رہا۔"

رہائی کے بعد جالب مادرِ ملت کے ساتھ انتخابی جلسے پڑھتے رہے، لائل پور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، جہلم وغیرہ میں جلسے ہوئے اور پھر انتخاب کی تاریخ آ گئی۔ مادرِ ملت اور ان کے ساتھی مجموعی فضا کو دیکھتے ہوئے پختہ تھے کہ عوام جیت جائیں گے مگر ایسا نہ ہوا اور جنرل ایوب کی جیت کا اعلان کر دیا گیا۔ جالب کا انتخابی نتیجے پر فوری تبصرہ بھی آ گیا تھا۔

دھاندلی، دھونس، دھن سے جیت گیا
ظلم پھر مکر و فن سے جیت گیا

حقیقت بڑی تلخ ہے مگر یہی ہے کہ مادرِ ملت کی شکست میں بہت اہم "اپنے" کا ہاتھ بھی تھا۔ بہر حال اس تفصیل میں یہاں جانے کا محل نہیں ہے۔ ہاں بدترین دھاندلی کے باوجود پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی اور حیدر آباد سے جنرل ایوب نہ جیت سکا۔ اور نہ ہی اس کی جیت کا اعلان کرنے کی کسی کو جرأت ہو سکی اور جنرل نے اپنی شکست کا بدلہ "لالو کھیت" (لیاقت آباد) کے باشندوں کے گھروں کو جلا کر لیا۔ اور بزدلوں نے یوں "جشنِ فتح" منایا۔ جالب نے جلتے گھروں اور لٹتے چمن کو اپنے اشعار میں یوں سمویا۔

کراچی میں جب صاحبِ جاہ نے جھونپڑے جلائے

نشیمنوں کو جلا کر کیا چراغاں خوب
سنوارے ہیں یونہی چہرۂ گلستاں خوب

کھلا کے شاخِ دل و جاں پہ پھول زخموں کے
مسرتوں کو کیا آپ نے نمایاں خوب
لہو اچھال کے اہلِ وفا کا راہوں میں
قدم قدم پہ کیا پاسِ دل فگاراں خوب
مچی ہے چاروں طرف آپ کے کرم کی دھوم
نبھائے آپ نے الفت کے عہد و پیماں خوب
ہر ایک بجھتا ہوا دیپ کہہ رہا ہے یہی
تمام رات رہا جشنِ نو بہاراں خوب

جنرل ایوب کا قہرمان دور جاری وساری رہا۔ اپوزیشن ''نام نہاد شکست'' کے بعد بکھری بکھری سی تھی۔ حالات یونہی چل رہے تھے۔ ایوبی آمریت کے خلاف اتحاد بن رہے تھے کہ ایسے میں ایک بڑا واقعہ رونما ہوا۔ ایران کا شہنشاہ رضا شاہ پہلوی پاکستان کے دورے پر آیا۔ آگے حبیب جالب سے سنیئے:

(30) ''ریاض شاہد ہمارے بڑے عزیز دوست تھے۔ وہ کافی ہاؤس میں ہمارے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ ریاض شاہد بے حد ذہین آدمی تھے۔ بڑے افسانہ نگار اور ناول نگار تھے اور اچھے شاعر بھی تھے۔ اداکارہ نیلو اپنے دور کی ایک اچھی رقاصہ تھی۔ اور ان کو اسی خوبی کی بناء پر اکثر فلموں میں کاسٹ کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں شہنشاہ ایران کے اعزاز میں کوئی تقریب تھی۔ اس کے لیے نیلو کو تیار رہنے کو کہا گیا۔ لیکن کہنے کا انداز مہذب نہیں تھا۔ نیلو کے ریاض شاہد سے تعلقات بن رہے تھے۔ ابتدائی تعلقات تھے یا ذرا آگے چلے گئے ہوں گے تو ریاض شاہد نیلو کو منہ پھاڑ کے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ''نہ جاؤ'' لیکن نیلو نے محسوس کر لیا کہ ریاض شاہد نہیں چاہتے کہ اس تقریب میں جایا جائے۔ اس پر کالاباغ کی طرف سے جو لوگ مامور تھے۔ انہوں نے غنڈہ گردی کی انتہا کر دی، نیلو بیگم نے ان سے کہا یا بہانہ بنایا کہ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور میں تقریب میں شرکت نہ کر سکوں گی'' اس انکار پر حکومتی غنڈں نے نیلو بیگم کو برا بھلا کہا۔

اور طمانچہ بھی مارا۔ نیلو نے جواب میں خواب آور گولیاں کھالیں۔ میں اور ریاض شاہد اسے دیکھنے یو۔سی۔ایچ (یونائیٹڈ کرسچن ہسپتال) گئے جب اسے دیکھ کر واپس آ رہے تھے تو میں نے ریاض شاہد سے کہا "نیلو بیگم نے بڑا ہی "اینٹی امپیریلسٹ" کردار ادا کیا ہے۔ اس نے شہنشاہ ایران کے سامنے جو امریکی سامراج کا اس علاقے میں سب سے بڑا SHO ہے، ناچنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پر ایک نظم ہوگئی ہے۔ ریاض شاہد نے کہا "سناؤ" تو میں نے نظم سنائی۔

نیلو

تُو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
تجھ کو انکار کی جرأت جو ہوئی تو کیونکر
سایہء شاہ میں اس طرح جیا جاتا ہے!
اہلِ ثروت کی یہ تجویز ہے سرکش لڑکی
تجھ کو دربار میں کوڑوں سے نچایا جائے
ناچتے ناچتے ہوجائے جو پائل خاموش
پھر نہ تازیست تجھے ہوش میں لایا جائے
لوگ اس منظرِ جانکاہ کو جب دیکھیں گے
اور بڑھ جائے گا، کچھ سطوتِ شاہی کا جلال
تیرے انجام سے ہر شخص کو عبرت ہوگی
سر اٹھانے کا رعایا کو نہ آئے گا خیال
طبعِ شاہانہ پہ جو لوگ گراں ہوتے ہیں
ہاں انہیں زہر بھرا جام دیا جاتا ہے
تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

ریاض شاہد نے بعد میں اسی نظم کو سامنے رکھ کر ایک کہانی فلسطین کے پس منظر میں لکھی اور فلم ''زرقا'' بنائی فلم اور موسیقی کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نظم میں معمولی ردو بدل کیا گیا اور یہی نغمہ ہٹ ہو گیا اور تاریخ کا حصہ بن گیا۔

اس لازوال نغمہ کو گلوکار مہدی حسن نے گایا تھا اور موسیقی کے ''عالم'' رشید عطرے نے اس کی دھن بنائی تھی اور ایسی دھن بنائی کہ عقل دنگ رہ گئی۔ یہ رشید عطرے صاحب ہی کا حصہ ہے۔ اس نغمہ میں لفظ ''اللہ'' کی ادائیگی اس زمانے کی پنجابی فلموں کی مزاحیہ اداکارہ رضیہ نے کی تھی۔

1965 کی جنگ میں پوری قوم سب کچھ بھول بھال کر ہندوستان کے خلاف صف آراء ہو گئی تھی۔ 6 ستمبر 1965 کے دن اچانک بلا کسی اشتعال و اعلان ہندوستانی فوجوں نے واہگہ اٹاری بارڈر پر حملہ کر دیا تھا۔ ادھر ہمارا جنرل صدر ایوب اور کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ کی بے خبری کا یہ عالم تھا کہ دشمن کے فوجی شالامار باغ میں گھوم رہے تھے اور ایک ڈبل ڈیکر بس کو بھی چلا کر اپنے علاقے میں لے گئے۔ جالب نے اس درجہ بے خبری کو آڑے ہاتھوں لیا اور ایک طویل نظم ''چھ ستمبر'' لکھی چونکہ اس نظم کو حکومت کے خلاف اعلان بغاوت کہا گیا اس لیے اس نظم کا پڑھا جانا ضروری ہے۔ ملاحظہ فرمائیں نظم۔

06 ستمبر

کوئی بے حِس بُھلا تا ہے بُھلا دے
نہ بُھولیں گے مگر لاہور زادے
وہ خونی چھ ستمبر کی شب غم
وہ ہیبت ناک توپوں کی دھمادھم
گِھرا شعلوں میں ''داتا کا نگر'' تھا
پہ سالا لیکن بے خبر تھا
اُدھر تھی فوجِ اعدا خیل در خیل
اِدھر نیندوں کے مارے نائم اللیل

اُدھر انبوہِ آدم بے کراں تھا
اِدھر انسان کا کم کم نشاں تھا
عدو اس حال کو بھی چال سمجھا
ہماری بے خودی کو ڈھال سمجھا
ہمارے مورچے اس نے سنبھالے
نہ لیکن بڑھ سکے اس کے رسالے
ہوئے ایسے وساوس میں گرفتار
کہ پابر جارہے مانندِ اشجار
ادھر سوئے ہوئے بھی جاگ اٹھے
ادھر گھبرا کے دشمن بھاگ اٹھے
ادھر تھا جذبہء شوقِ شہادت
ادھر مال و زر و زن کی محبت
تھا سیلِ کفر ایماں کے مقابل
مگر کب پیش حق ٹھہرا ہے باطل
تھا جس کے پاس جو، وہ لے کے آیا
خدا کے نام پر سب کچھ لٹایا
سرِ میداں تھے مصروفِ تگ و تاز
عساکر کے جواں مردانِ سرباز
دعائیں تھیں زباں پر اہل دیں کی
الٰہی خیر اپنی سرزمیں کی
نکل آئے کفن سر پر لپیٹے
کسانوں اور دہقانوں کے بیٹے
وطن کا بچہ بچہ یوں پکارا
نہ جھکنے دیں گے اپنا چاند تارا
دیے تک زیور اپنے بیٹیوں نے
عروسوں، ماؤں، بہنوں، بیٹیوں نے
حماقت جو ہوئی نادانیوں سے

شجاعت بن گئی قربانیوں سے
بچایا تب کہیں جاکر وطن کو
جھکایا یوں لوائے اہرمن کو
جو کہتے تھے کہ جم خانے چلیں گے
وہاں عشرت کے پیمانے چلیں گے
ملے یوں خاک میں ان کے ارادے
کوئی جیسے پہاڑوں سے گرادے
وہ جو لاہور لینے کو چلے تھے
کھلی جب آنکھ دلی میں پڑے تھے

یہاں جب جانسن نے مات کھائی
تو کــــوسیجـــــن سے اپنی سُر ملالی

ہزاروں میل سے "اوتھانٹ" آیا
پیامِ صلح اپنے ساتھ لایا
ہوئے خوش تاشقند اعلان پر ہم
رہی چشمِ گل و لالہ میں شبنم
ہوا کشمیر اک بھولی کہانی
شہیدوں کا لہو گویا تھا پانی
یہی خوں جنگ میں تھا کام آیا
یہی خوں مال پر ہم نے بہایا
یہی خوں انتقامِ خوں بھی لے گا
ستم گر کی کلائی موڑے گا
نظام زر سے ہم خیرات کیوں لیں
سحر کا نور دے کر رات کیوں لیں
نظامِ زر سے ہر غارت گری ہے
کہ دشمن آدمی کا آدمی ہے
یہ سن لیں غور سے مالک ملوں کے

کہ سودے ہو نہیں سکتے دلوں کے
یہ کیسا دور نا فرجام آیا
کہ غاصب بن گیا اپنا پرایا
حقوقِ آدمیت چھن گئے ہیں
بُرے دن آئے اچھے دن گئے ہیں
مسلط آمریت ہے وطن پر
خزاں کا راج ہے صحنِ چمن پر
جو حق انساں کو تھا صدیوں سے حاصل
ہوا ہے آج وہ حق حرفِ باطل
جو آزادی ملی تھی گھر لٹاکر
اب اس کو رو رہے ہیں منہ چھپا کر
وہ آزادی کہ جس کو خوں دیا تھا
بہر قیمت جسے حاصل کیا تھا
ہیں قابض اس پہ آزادی کے دشمن
شبِ غم چھائی ہے مسکن بہ مسکن
سکوں غائب مسرت بے نشاں ہے
جو مانگی تھی وہ آزادی کہاں ہے
اندھیرے ظلم کے چھائے ہوئے ہیں
خیال و فکر تھرائے ہوئے ہیں
نہیں ہے جرأتِ تقریر و تحریر
زبان و خامہ کو ہے خوفِ تعزیر
جریدے اگلے وقتوں کے گزٹ ہیں
وزیر و شاہ کے قامت پہ فٹ ہیں
نظر آتی ہے اک تصویر ہر روز
وہی بے ربط سی تقریر ہر روز
لبِ فریاد پہ تالے پڑے ہیں
کہ جیسے ہم سرِ مقتل کھڑے ہیں

فضا غم کی بدل جائے گی آخر
ستم کی رات ڈھل جائے گی آخر

جو نظم 1965 کی جنگ سے شروع ہوئی تھی آگے چل کے اس میں ''خارجہ امور'' پر بھی اظہار شامل ہو گیا اور حکومت کے عوام دشمن رویوں کا بھی ذکر آ گیا۔ اور ایک فوجی آمر نے جس طرح ملک کو یرغمال بنا رکھا تھا اس کا تمام احوال بھی نظم میں بیان ہو گیا۔ یہ تمام وجوہات تھیں جس کو بنیاد بنا کر ایوب حکومت نے اس نظم پر پابندی عائد کر دی اور یہ کہا کہ ''اس نظم سے بعض دوست ممالک کے ساتھ دوستی پر زد پڑتی ہے اور حکومت کی خارجہ پالیسی بھی متاثر ہوتی ہے۔'' یہ نظم حبیب جالب کی کتاب ''سرِ مقتل'' میں بھی شامل تھی۔

سرمقتل

برگِ آوارہ کے بعد حبیب جالب کا دوسرا مجموعہ کلام شائع ہوا۔ ''سرِ مقتل'' جو حبیب جالب کی زندگی کا اہم ترین سنگِ میل ہے۔ ستمبر 1966 میں اس کتاب کے چار ایڈیشن شائع ہوئے جو ایک ریکارڈ ہے۔ کتاب مارکیٹ میں آتی تھی اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھی۔ ستمبر 1966 سے نومبر 1966 تک کتاب کے سات ایڈیشن شائع ہوئے پھر کتاب بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔ اس کتاب کے ناشر مکتبہ کارواں کے چودھری عبدالحمید تھے جنہیں گرفتار اور پریس ''سیل'' کر دیا گیا، سرِ مقتل کے وہ تمام ایڈیشن جو آنے والے تھے ضبط کر لیے گئے اور چودھری صاحب کے خلاف باقاعدہ مقدمہ درج کر لیا گیا۔ مگر ''سرِ مقتل'' کو ملک بھر میں مزدوروں، ہاری تنظیموں اور سیاسی کارکنوں نے ہزاروں کی تعداد میں خفیہ طور پر چھاپہ خانوں میں چھاپ چھاپ کر تقسیم کیا۔ اس کتاب میں حبیب جالب کا عوامی شاعرانہ جوہر کھلا، احتجاج تھا جو آمرِ وقت (جنرل ایوب) کے خلاف تھا۔ اور بعد کو ہر آنے والے آمر نے بھی اُسے اپنے خلاف ہی سمجھا۔

یومِ حمید نظامی

(31) 26رفروری 1967وائی ، ایم ، سی اے ہال لاہور میں ''یوم حمید نظامی'' کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس تقریب کی صدارت ذوالفقار علی بھٹو نے کی اور اسٹیج سیکرٹری کے فرائض آغا شورش کاشمیری نے ادا کیے۔ اس تقریب کے دیگر مقررین میں میاں محمد شفیع (م ش) ملک اسلم حیات اور ملک حامد سرفراز نمایاں تھے جبکہ حبیب جالب نے اپنی نظم ''چھ ستمبر'' سنائی۔ اگلے روز تھانہ پرانی انارکلی پولیس نے جالب صاحب کو''ڈیفنس آف پاکستان رولز'' کے تحت ضبط شدہ کتاب ''سرِ مقتل'' میں شامل نظم ''چھ ستمبر'' سنانے پر گرفتار کرلیا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ حبیب جالب کا اقدام ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ (6) 41 کے منافی ہے۔ اس مقدمہ میں ایڈیشنل سیشن جج چودھری محمد ظفر اللہ نے طرفین کے دلائل سننے کے بعد سات مارچ 1967 کوحبیب جالب کی ضمانت کی درخواست منظور کرلی تھی۔ ایڈیشنل سیشن جج نے اپنے فیصلے میں کہا کہ ''ڈیفنس آف پاکستان رولز کے نظر بندوں کی ضمانت لینے کی عدالت مجاز ہے۔''

ایڈیشنل سیشن جج کے فیصلے کے خلاف اور حبیب جالب کی ضمانت منسوخ کرنے کے لیے صوبائی پبلک پراسی کیوٹر مسٹر اسلم ریاض حسین نے ایک درخواست لاہور ہائی کورٹ کے فل بینچ کے روبرو پیش کی۔ فل بینچ مسٹر جسٹس بشیر الدین احمد، مسٹر جسٹس ایم جمیل اصغر اور مسٹر جسٹس شیخ شوکت علی پر مشتمل تھا۔ حکومت کی جانب سے ایڈووکیٹ جنرل راجہ سید اکبر پیش ہوئے جبکہ حبیب جالب کی طرف سے پیروی میاں محمود علی قصوری نے کی۔ فل بینچ لاہور ہائی کورٹ نے حکومتی موقف کو تسلیم کرتے ہوئے حبیب جالب کی ضمانت منسوخ کردی اور یوں پولیس نے

انہیں گرفتار کر کے جوڈیشل حوالات پہنچ دیا، جہاں سے انہیں بوسٹل جیل بھجوادیا گیا بعدازاں جالب صاحب کا کیس ایک خصوصی ٹریبونل میں پیش کیا گیا، جہاں (32) 30رمئی 1967 کو ان کی دس ہزار روپے کی ضمانت منظور کی گئی اور وہ رہا ہوئے۔

جالب صاحب کی اس مقدمے میں ضمانت منظور ہونے کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے، جالب صاحب کے وکیل اسلم حیات صاحب نے جج صاحب سے کہا کہ یہ حکومتی اہلکار نظم کتاب سے نقل کر کے لے آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ جلسہ گاہ میں لکھی ہے۔اس پر جج صاحبان نے سرکاری وکیل سے پوچھا ''آپ پانچ شعر کتنی دیر میں لکھ سکتے ہیں'' سرکاری وکیل بولا ''جناب پانچ منٹ میں'' اس پر ٹریبونل کے جج صاحبان کے کہنے پر جالب صاحب نے نظم ''چھ ستمبر'' پڑھنا شروع کردی، جالب صاحب کہتے ہیں:

> (33) ''میں پندرہ منٹ تک نظم پڑھتا رہا اور جب جج صاحبان نے سرکاری وکیل سے پوچھا کہ ''کتنے شعر نوٹ کیے'' تو سرکاری وکیل خاموش تھا، جج صاحبان نے سرکاری وکیل سے کاغذ طلب کیا تو اس پر صرف ساڑھے تین شعر لکھے ہوئے تھے کیونکہ سرکاری وکیل ''نائم اللیل'' کے ہجے نہیں جانتا تھا، جج صاحبان نے یہ صورت حال دیکھ کر کہا ''کتابوں سے نظمیں لکھ کر آجاتے ہیں'' اور مجھے ضمانت پر رہا کردیا۔''

مادرِ ملت کا انتقال

9رجولائی 1967 کو جالب صاحب روزنامہ نوائے وقت لاہور کے ایڈیٹر مجید نظامی کے ساتھ ان کے دفتر میں بیٹھے تھے کہ ایک صحافی گھبرایا گھبرایا سا کمرے میں داخل ہوا اور بولا ''ایک بہت بُری خبر ہے'' اور پھر بتایا کہ ''مادرِ ملت کا انتقال ہوگیا ہے'' پورے ملک اور قوم کے لیے یہ سانحہء عظیم تھا۔جالب نے فی البدیہہ تین اشعار کہے۔

اب رہیں چین سے بے درد زمانے والے
سوگئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

دیکھنے کو تو ہزاروں ہیں، مگر کتنے ہیں
ظلم کے آگے کبھی سر نہ جھکانے والے
مر کے بھی مرتے ہیں کب مادرِ ملت کی طرح
شمع تاریک فضاؤں میں جلانے والے

(جالب صاحب کے انتقال کے بعد، ان کی لوحِ مزار کے لیے راقم الحروف نے پہلے شعر کا انتخاب کیا تھا اور وہی شعر وہاں کندہ ہے)

اب رہیں چین سے بے درد زمانے والے
سو گئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

بھٹو اور جالب

بھٹو جب ایوب خان کی کیبنٹ میں تھے تب بھی نجی دوستوں میں اس خواہش کا اظہار کر چکے تھے کہ ''کیا ہم اپوزیشن پوئیٹ'' کو نہیں سن سکتے؟'' تاشقند اعلان کے بعد جنرل ایوب اور بھٹو صاحب میں اختلافات ہو گئے تھے۔ بھٹو صاحب ایوب حکومت میں وزیر خارجہ تھے اور تاشقند معاہدے پر وہ متفق نہ تھے اور آہستہ آہستہ حکومتی ایوانوں سے اختلاف کی خبریں نکل کر ملک بھر میں پھیل رہی تھیں۔ مضمحل متحدہ اپوزیشن اس اختلاف سے بظاہر خوش نظر آ رہی تھی کہ ایک ذہین نوجوان Modern Democrate جدید سائنٹفک خیالات رکھنے والا شخص حکومت سے اختلاف کر رہا ہے۔ اس وقت موجود تمام اپوزیشن جماعتوں نے مل کر بھٹو صاحب کی حوصلہ افزائی کے تاثر کو ابھارا یوں کہہ لیں کہ اپوزیشن جماعتیں بھٹو صاحب کے لیے نرم گوشہ رکھتی تھیں۔ اور پھر جب یہ خبریں بھی آنے لگیں کہ جنرل ایوب نے بھٹو صاحب سے سیاست چھوڑ کر علاج کے بہانے ملک سے باہر چلے جانے پر دباؤ بڑھا دیا ہے تو جالب صاحب نے بھٹو صاحب کے لیے ایک نظم لکھی جو ایک طرح سے اپوزیشن جماعتوں کی جانب سے بھٹو کے لیے خصوصی پیغام تھا کہ آئندہ مل کر جمہوری تحریک چلانا ہے۔

چھوڑ کے نہ جا

دستِ خزاں میں اپنا چمن چھوڑ کے نہ جا
آواز دے رہا ہے وطن چھوڑ کے نہ جا
دل تنگ کیوں ہے رات کی تاریکیوں سے تو
پھوٹے گی صبحِ نو کی کرن چھوڑ کے نہ جا
تیرے شریک حال ہیں منصور اور بھی
سونی فضائے دارورسن چھوڑ کے نہ جا
اے دوست چشمِ غیر میں بے آبرو نہ ہو
اے درِ شاہوار، عدن چھوڑ کے نہ جا
ہر چند راستے میں شکاری ہیں خیمہ زن
تو ہے اگر غزالِ ختن چھوڑ کے نہ جا
قالین کا شیر ناچ رہا ہے مصاف میں
مردانِ صف شکن کا چلن چھوڑ کے نہ جا
''البانیہ'' کے پھول بھی گو دلفریب ہیں
اپنے وطن کے سروسمن چھوڑکے نہ جا
مسحور ہے ابھی ترے نغموں سے انجمن
سب دے رہے ہیں دادِ سخن، چھوڑ کے نہ جا
کچھ تیری ہمتوں پہ بھی الزام آئے گا
مانا کہ راستہ ہے کٹھن، چھوڑ کے نہ جا
اے ذوالفقار، تجھ کو قسم ہے حسینؓ کی
کر احترامِ رسم کہن چھوڑ کے نہ جا

آگے بھٹواور جالب کی پہلی ملاقات کا احوال ہے۔لہٰذا اسے جالب کی زبانی سنیے:

''چھوڑ کے نہ جا'' نظم روزنامہ نوائے وقت کے Back Page پر جلی حروف میں چھپی تھی اوراس روز کا اخبار پانچ روپے میں فروخت ہواتھا۔1966 کے اوائل

کا زمانہ تھا۔ میری ذوالفقار علی بھٹو سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر نظم کے ذریعے میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی تھی کہ تم آمروں کے سامنے ڈٹے رہو اور ملک چھوڑ کے نہ جاؤ، ایک امید، ایک آس تم سے بندھی ہوئی ہے کہ تم غریب اور مفلوک الحال لوگوں کی آواز بن کر ابھرو گے، کیونکہ ہمارا مشن یہی تھا یہی نظریہ حیات اور نظریہ فن بھی کہ آمریت کے خلاف اٹھنے والی ہر شکل اور صورت کا بھرپور ساتھ دیں، جمہوریت کی منزل کو پانے کے لیے جمہوری تحریک کو آگے بڑھانے والے ہی ہمارے ہم خیال ہو سکتے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو ان دِنوں ''فلیٹیز ہوٹل لاہور'' میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں سے ان کے ایک ساتھی امان اللہ خان نے مجھے فون کیا کہ ''بھٹو صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' میں کافی ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ ''میں وزراء سے ملا نہیں کرتا، وہ وزارت میں ہوں یا سابق ہوں، اگر وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو میرے پاس کافی ہاؤس آ جائیں'' میں نے سوچا وہ نہیں آئیں گے، مگر تھوڑی دیر بعد ان کی طرف سے پھر فون آیا کہ ''وہ آ رہے ہیں۔'' ان کے آنے سے پہلے میں نے کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے نوجوان دوستوں کو بریف کیا کہ ''بھٹو صاحب آ رہے ہیں ایک پروٹوکول ہوتا ہے اس کا خیال رکھیے گا۔ آپ جو باتیں پوچھنا چاہیں، اخلاق اور دائرہ ادب میں رہ کر پوچھیے گا، کوئی ایسی بات نہ پوچھیے گا جس سے ہمارے مہمان کی دل شکنی ہو اور یہ کہ کافی ہاؤس کی بڑی عظیم روایت ہے یہاں بڑے بڑے عظیم المرتبت لوگ بیٹھا کرتے تھے اور بیٹھتے ہیں۔ مولانا چراغ حسن حسرت، عبداللہ بٹ، ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض اور تقسیم سے پہلے ہندو مسلم سکھ اکٹھے بیٹھتے تھے تو اس طرح میں نے سب کو سمجھا دیا کیونکہ بھٹو صاحب ایوب خان سے نئے نئے الگ ہوئے تھے اور نوجوانوں میں ادیبوں، شاعروں، دانشوروں میں ایوبی آمریت کے خلاف جو غم و غصہ تھا، تو مجھے اندیشہ

تھا کہ کہیں بھٹو صاحب پر بھی انتہائی تنقید نہ ہو کہ جو اس وقت بے محل ہوتی، شکر ہے کہ دوستوں نے میری بات کو سمجھا۔

بھٹو صاحب اپنی گاڑی میں کافی ہاؤس آئے۔ وہ پڑھا لکھا اور ذہین آدمی تھا۔ نوجوان ادیب ان سے گھل مل کر گفتگو کرتے رہے اور بڑے سلجھے ہوئے انداز میں گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ بھٹو صاحب کا طرزِ گفتگو اس طرح کا تھا کہ جیسے وہ سب کو مطمئن کر رہے ہوں اور حالات ان کے کنٹرول میں ہوں۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور بولے ''اچھا تو دوستی ہوئی؟ میں آپ کے پاس آیا ہوں اگر اب میں آپ کو بلاؤں تو آپ آئیں گے؟'' میں نے کہا ''جی ہاں'' پھر انہوں نے کہا ''اب وہ نظم سنائیں جو آپ نے میرے لیے کہی ہے'' میں نے کہا ''جناب اب اس نظم کی افادیت نہیں رہی اور ویسے بھی آپ کے لیے کہی ہوئی نظم آپ کے سامنے سنانا سراسر خوشامد ہوگی جو میری فطرت کے خلاف ہے'' وہ مسکرائے اور کہا ''اچھا ٹھیک ہے'' اور چلے گئے۔''

اور پھر بھٹو صاحب جنرل ایوب کو چھوڑ کر باہر آ گئے اور پیپلز پارٹی کا قیام عمل میں آ گیا۔ مجھے یاد ہے کہ کراچی کے نشتر پارک میں پیپلز پارٹی کا جلسہء عام تھا اور جلسہ گاہ کے چار اطراف میں جالب کے چار مصرعے چالیس چالیس گز کے ایک ایک تھان پر لکھے ہوئے تھے، ''کھیت وڈیروں سے لے لو'' ''ملیں لٹیروں سے لے لو'' ''ملک اندھیروں سے لے لو'' اور عین اسٹیج کے عقب میں یہ مصرعہ تھا ''رہے نہ کوئی عالی جاہ'' ان مصرعوں کے گھیراؤ میں کراچی میں پیپلز پارٹی کا پہلا جلسہ عام ہوا تھا۔ جلسہ میں ذوالفقار علی بھٹو، معراج محمد خان، رسول بخش تالپور و دیگر نے خطاب کیا تھا پھر بھٹو صاحب کراچی سے بذریعہ ٹرین لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ جنرل ایوب کی حکومت جاری تھی اور حکومتی خوف وہراس بھی جوں کا توں موجود تھا۔ بھٹو صاحب کے ساتھ جو لوگ کھڑے تھے وہ بڑے حوصلے کے لوگ تھے۔ ادھر لاہور میں پیپلز پارٹی کی مقامی قیادت پریشان تھی انہیں بھٹو صاحب کے لاہور اسٹیشن پر استقبال کے لیے کوئی شخصیت نظر نہیں آ رہی تھی۔ احمد رضا قصوری

نے یہ واقعہ ''بلاتکلف'' نامی ٹی وی پروگرام میں پروگرام کے میزبان نعیم بخاری کو یوں سنایا ''ہم سب دوست اور پارٹی کی مقامی قیادت پریشان تھے کہ کل بھٹو صاحب کو لاہور ریلوے اسٹیشن پر کون Receive کرے گا۔ ملک میں لوگ ابھی تک ڈرے ہوئے تھے۔ ہم پیپلز پارٹی کے دوست اکٹھے بیٹھے اسی سوچ بچار میں غرق تھے کہ اچانک میرے ذہن میں ایک شخص کا خیال آیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ''مل گیا'' وہ شخص مل گیا'' مگر دعا کرو کہ وہ درویش صفت شخص مان جائے'' دوستوں نے پوچھا ''کون ہے وہ شخص'' تو میں نے بتایا ''حبیب جالب'' اور پھر ہم سب حبیب جالب کے پاس گئے اور ان کے سامنے مسئلہ رکھا اور وہ بھٹو صاحب کے استقبال کے لیے تیار ہو گئے۔

پیپلز پارٹی کے قیام سے ملک بھر کے جمہوری سوچ رکھنے والے لوگ بڑے خوش تھے۔ بائیں بازو کے خیالات سے متفق اہلِ قلم بھی متحرک ہو رہے تھے۔ انھی دنوں میں سندھ کے ترقی پسند ادیبوں، دانشوروں نے لاڑکانہ میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ فیض احمد فیض نے اس مشاعرے کی صدارت کی تھی۔ بھٹو صاحب کے پاس مشاعرے کے منتظمین تعاون حاصل کرنے کے لیے گئے تو انہوں نے بھرپور تعاون کی یقین دہانی کروائی۔ اور یہ بھی کہا کہ فیض اور جالب ان کے ذاتی مہمان ہوں گے اور میرے گھر ''المرتضیٰ'' میں قیام کریں گے۔ یوں فیض اور جالب بھٹو صاحب کے مہمان بنے۔ صبح بھٹو، فیض اور جالب المرتضیٰ کے لان میں ٹہل رہے تھے۔ بھٹو صاحب ''معاہدہ تاشقند'' پر بات کر رہے تھے۔ فیض اور بھٹو کے درمیان مکالمہ جاری تھا۔ بھٹو صاحب نے جالب کو شریک گفتگو کرتے ہوئے ان کی رائے پوچھی، اس پر جالب صاحب نے بوجوہ رائے دینے سے گریز کیا۔

یہ ایک یادگار مشاعرہ تھا جو عرصہ دراز بعد (انجمن ترقی پسند مصنفین کی سالہا سال کی بندش کے بعد) بائیں بازو کے لوگوں نے آرگنائز کیا تھا۔ بھٹو صاحب کے ''عوامی سیاسی'' دور کی وجہ سے لوگوں میں بڑا حوصلہ پیدا ہوا تھا۔ عوام بھٹو صاحب کے دیوانے تھے اور بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کے بہت سے لوگ پیپلز پارٹی میں شامل ہو رہے تھے۔ اس زمانے میں بائیں بازو کی

مضبوط ترین جماعت نیشنل عوامی پارٹی تھی، پورے ملک بشمول مشرقی پاکستان میں اس جماعت کی
جڑیں موجود تھیں، خان عبدالولی خان، اجمل خٹک، ارباب سکندر خان خلیل، غلام احمد بلور،
صوبہ سرحد سے بلوچستان سے میر غوث بخش بزنجو، عطاء اللہ مینگل، خیر بخش مری، گل خان نصیر،
سندھ سے محمود الحق عثمانی، عبدالحمید جتوئی، انیس ہاشمی، عزیز اللہ شیخ، عبدالرشید ایڈوکیٹ بنگال سے
پروفیسر مظفر احمد اور پنجاب سے میاں محمود علی قصوری، راؤ مہروز اختر، حبیب جالب، قسور گردیزی،
یہ تمام اور دیگر دل و جان سے اپنی جماعت کے ساتھ تھے کہ میاں محمود علی پنجاب کے دیگر ساتھیوں
سمیت پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اُس روز جب حالات سے بے خبر حبیب جالب،
میاں محمود علی قصوری کی کوٹھی پہنچے تو خلاف توقع بڑا ہجوم دیکھا پھر پتہ چلا کہ بھٹو صاحب آئے
ہوئے ہیں۔ جالب پھر بھی نہ سمجھ سکے اور بھٹو صاحب کی آمد پر یہی سمجھے کہ میاں صاحب
بھٹو صاحب کے وکیل ہیں کوئی مشورہ لینے آئے ہوں گے اسی اثنا میں احمد رضا قصوری نے جالب
کو دیکھ کر آواز لگائی ''میاں صاحب تو پیپلز پارٹی میں آ گئے اب آپ کب آئیں گے'' یہ سن کر
جالب صاحب حیران و ششدر، احمد رضا قصوری کے قریب گئے اور کہا ''بے وقوف ہو گئے ہو،
کبھی سمندر بھی ندی نالوں میں گرے ہیں'' اتنے میں قصوری صاحب اندر سے نکلے اور
جالب صاحب کو لے کر اندر کمرے میں چلے گئے، بھٹو صاحب بھی وہاں بیٹھے تھے،
قصوری صاحب بولے ''بھٹو صاحب، جالب صاحب نیشنل عوامی پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے رکن
ہیں، انہیں بھی قومی اسمبلی کا ٹکٹ دینا ہے'' اس پر بھٹو صاحب نے کہا ''جالب میرا دوست ہے
آپ اس کی سفارش نہ کریں، میں ان کے الیکشن پر روپیہ لگاؤں گا، تقریر کروں گا، مرکزی وزیر
بناؤں گا'' اور جالب نے جواباً کہا ''جناب بھٹو صاحب میں تو آپ کی پارٹی میں ہی نہیں آرہا''
ایک شاعر کے انکار پر بھٹو صاحب کو بڑا دھچکا لگا اور وہ یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے
"Ok Discuss with Mr. Kasuri" پھر میاں محمود علی قصوری صاحب نے تمام تر
کوششیں کر ڈالیں، مگر جالب صاحب ٹس سے مس نہیں ہوئے اور انہوں نے اپنی جماعت سے

غداری نہیں کی۔ پیپلز پارٹی کے ساتھ اک ہجوم تھا پورے ملک میں اس جماعت کے ساتھ عوام کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا، مگر جالب کے اپنے اصول تھے، اپنی سوچ تھی، انہوں نے لکھا۔

ہجوم دیکھ کے رستہ نہیں بدلتے ہم
کسی کے ڈر سے تقاضا نہیں بدلتے ہم
ہزار زیرِ قدم راستہ ہو خاروں کا
جو چل پڑیں تو ارادہ نہیں بدلتے ہم
اسی لیے تو نہیں معتبر زمانے میں
کہ رنگ صورتِ دنیا نہیں بدلتے ہم
ہوا کو دیکھ کے جالب مثالِ ہم عصراں
بجا یہ زعم ہمارا نہیں بدلتے ہم

اور پھر عوام کے بڑھتے سیلاب کے آگے فیلڈ مارشل نہ ٹھہر سکا۔ اور جنرل ایوب خان جاتے جاتے اقتدار اپنے فوجی ساتھی جنرل یحییٰ خان کو دے گئے اور تصویر بدل دی گئی۔ ایوب خان کی جگہ یحییٰ خان کی تصویر آ گئی۔ اور جشن مری کے مشاعرے میں دس سالہ بندش کے بعد جالب صاحب کو پھر بلایا گیا۔ مشاعرے کی صدارت جناب فیض احمد فیض کر رہے تھے، جالب صاحب اپنی باری پر مائیک کے سامنے آئے اور بولے ''حضرات آج میری تمام تر آزادیاں بحال ہیں کیونکہ ایک شاعر اس مشاعرے کی صدارت کر رہا ہے'' پھر جالب صاحب نے صاحبِ صدر فیض صاحب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''فیض صاحب اکثر مجھ سے کہا کرتے ہیں ''اوئے غزل پڑھ'' تو آج میں فیض صاحب کے حکم کی تعمیل میں غزل پڑھوں گا۔ اور میری غزل کی مخاطب یہ تصویر ہے۔ جو ہال میں تبدیل شدہ حالات کے تحت لگ گئی ہے۔ میں نئے فوجی حکمران جنرل یحییٰ خان کی تصویر سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنی تازہ غزل پیش کر رہا ہوں'' اس پر فیض صاحب نے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈپٹی کمشنر کو کہنی مار کر کہا'' لے بھئی آ گیا تیرا دشمن'' اور جالب صاحب یوں غزل سرا ہوئے۔

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا

اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا
کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ
وہ کہاں ہیں کہ جنہیں ناز بہت اپنے تئیں تھا
اب وہ پھرتے ہیں، اسی شہر میں تنہا، لیے دل کو
اک زمانے میں مزاج ان کا، سرِ عرشِ بریں تھا
آج سوئے ہیں تہہ خاک نجانے یہاں کتنے
کوئی شعلہ کوئی شبنم، کوئی مہتاب جبیں تھا
چھوڑنا گھر کا ہمیں یاد ہے جالب نہیں بھولے
تھا وطن ذہن میں اپنے، کوئی زنداں تو نہیں تھا

جالب کی پوری زندگی یونہی آمروں سے لڑتے اور جیلیں، تھانے بھگتاتے گزری، ''برگِ آوارہ'' کے رومانی غزل گو شاعر نے پورے شعور اور یقین کے ساتھ ''کوئے یار'' سے ''سوئے دار'' کا سفر اختیار کیا تھا، جالب کہتے تھے ''جب غزل گائیکوں نے میری غزلیں محفلوں میں سنا سنا کر ''ایلیٹ کلاس'' کو محظوظ کرنا شروع کیا کہ جن کی میں نیندیں اڑا دینا چاہتا تھا تو میں نے ''دل کی بات لبوں پر لاکر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں'' کو ''ایسے دستور کو صبح بے نور کو میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا'' میں بدل دیا اور کہا کہ اے مہدی حسنو، فریدہ خانموں اب اسے گاؤ'' جالب کے کلام کو ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ کے لیے پابندی لگادی گئی تھی جالب کہتے ہیں ''تمام بڑے شعراء موچی گیٹ پر آنا اپنی توہین سمجھتے تھے، یوں میں اکیلا ہی موچی گیٹ پر کھڑا رہ گیا'' جالب پر ذرائع ابلاغ بند کر کے بھی حکمراں اس کی آواز نہ دبا سکے بلکہ اس کی شاعری اور شدت کے ساتھ ابھری اور دور دور تک پھیلتی چلی گئی۔ جالب کا کلام عوام کے ذریعے گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، شہر شہر پہنچتا تھا اس وقت مجھے 1967 میں ہونے والا مشاعرہ یاد آرہا ہے، جو، کے جی اے گراؤنڈ پرانی نمائش کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ پورا گراؤنڈ سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، لوگ ٹکٹ لیکر مشاعرہ گاہ میں آئے تھے جو ٹکٹ لینے کی طاقت نہ رکھتے تھے وہ دیواریں پھلانگ کر اندر داخل ہوئے۔

اس مشاعرے کے اہم آرگنائزر جوہر حسین تھے، پروفیسر کرار حسین کے صاحبزادے اور معروف

طالب علم رہنما بحالی جمہوریت کی تحریک میں انہوں نے بڑی ماریں کھائیں۔ جنرل ایوب جا چکے تھے اور جنرل یحییٰ آ چکے تھے اس مشاعرے میں دس سالہ بندش کے بعد حبیب جالب بھی مدعو کیے گئے تھے، مجھے خوب یاد ہے حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت فیض احمد فیض اور حبیب جالب کی آمد کے مناظر قابلِ دید تھے، تینوں شعرا کرام اسی ترتیب سے مشاعرہ گاہ میں آئے اور موجود ہزاروں سامعین نے پُر جوش و والہانہ استقبال کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہا تھا۔ مشاعرہ گاہ کے باہر پولیس کے اعلیٰ عہدیداران معہ وائرلیس جیپوں کے بھاری نفری کے ساتھ موجود تھے۔ پولیس کی اس قدر نفری اور اعلیٰ پولیس افسران کی موجودگی محض اسی وجہ سے تھی کہ حبیب جالب مشاعرے میں آ رہے تھے۔ مشاعرے میں جب حبیب جالب کا نام پکارا گیا تو پورا پنڈال کھڑا ہو گیا اور تالیوں، نعروں کی گونج میں جالب صاحب مائیک کے سامنے آئے۔ نعروں، تالیوں کا شور تھما تو جالب صاحب نے جوہر حسین سے کہا ''جوہر حسین اسٹیج پر آؤ، جوہر حسین کہاں ہو، اوپر آؤ'' جوہر حسین اگلی صف میں بیٹھے تھے، انہوں نے اپنی نشست سے ہی کھڑے ہو کر جالب صاحب سے شعر پڑھنے کی درخواست کی، مگر جالب صاحب مصر تھے اور جوہر حسین سے کہہ رہے تھے ''یہ میرے سامنے سے ریڈیو، ٹی وی کے مائیک ہٹائے جائیں'' ''میں صرف مشاعرے کا مائیک استعمال کروں گا'' اور آخر جالب صاحب کی بات مان لی گئی۔ اب جالب صاحب مشاعرہ مائیک کے ذریعے لوگوں سے مخاطب ہوئے اور ان سے پوچھا ''کیا میرا کلام آپ تک ریڈیو، ٹی وی کے ذریعے پہنچا'' لوگوں نے بآواز بلند کہا ''نہیں، نہیں'' تو جالب صاحب نے نفرت و حقارت سے ریڈیو، ٹی وی کے مائیکروفونز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''تو ہٹاؤ ان حقوں کو'' اس کے بعد جالب صاحب اپنے سی آئی ڈی کے ''دوستوں'' سے بولے ''کاپی پنسل نکال لو میں شروع ہو رہا ہوں'' جالب نے آغاز جنرل یحییٰ خان کو مخاطب کرتے ہوئے کیا۔

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں، تخت نشیں تھا
اُس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ، اتنا ہی یقیں تھا

اس کے بعد جالب صاحب دیر تلک اپنی شاعری سناتے رہے اور سامعین نے کئی بار بلوا بلوا کر

انہیں سنا اگلے روز روزنامہ جنگ کراچی میں انعام درانی صاحب نے اپنے کالم ''تلخ و شیریں'' میں لکھا ''جالب مشاعرہ لوٹ کر اپنے ساتھ لے گیا'' ایسے کئی مشاعرے جالب کی زندگی میں منعقد ہوئے جہاں انہیں اسی احترام، محبت اور چاہت کے ساتھ سنا گیا اور یہ مقام و مرتبہ جالب کو یونہی حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ یقین کا شاعر تھا، جہدِ مسلسل اور ہر غم، دکھ سہہ جانے کا حوصلہ حد درجہ اللہ نے جالب کو عطا فرمایا تھا، وہ کہتا ہے ؎

غم اٹھانے میں ہے کمال ہمیں
کر گیا فن یہ لازوال ہمیں

جنرل ایوب کے دور میں ''سرِ مقتل'' پر پابندی لگی تو جالب نے جواب دیا۔

مرے ہاتھ میں قلم ہے، مرے ذہن میں اُجالا
مجھے کیا دبا سکے گا، کوئی ظلمتوں کا پالا
مجھے فکر امنِ عالم، تُجھے اپنی ذات کا غم
میں طلوع ہو رہا ہوں، تُو غروب ہونے والا

اور دنیا نے دیکھا کہ ''آمر'' غروب ہو گیا اور ''سچ'' آج بھی زندہ ہے اور اس کی تابندگی میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ جنرل یحییٰ خان نے الیکشن 1970 کا اعلان کیا تو سیاسی جماعتوں کے منشور بھی سامنے آ گئے۔ بھٹو صاحب نے اپنی جماعت کا منشور دیا۔ اور شیخ مجیب نے اپنی جماعت کا منشور دیا۔ الیکشن کے بعد نتائج سامنے آئے تو پورے ملک میں شیخ مجیب الرحمٰن کی جماعت عوامی لیگ اکثریتی جماعت بن کر سامنے آ گئی۔ پیپلز پارٹی پنجاب اور سندھ میں بھاری اکثریت سے جیتی۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علماء اسلام جیت کر نمایاں تھے۔

جنرل یحییٰ خان نے 3/مارچ 1970 کو ڈھاکہ میں نومنتخب قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا۔ اب آگے کی ''داستانِ دلِ دو نیم'' جالب کی زبانی سنیے:

(34) ''مشرقی پاکستان ہماری جماعت نیشنل عوامی پارٹی کے لوگ گئے تھے جہاں

ہماری پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کا اجلاس یکم مارچ کو ہونا تھا۔ مغربی پاکستان سے نومنتخب قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے سردار شوکت حیات مولانا مفتی محمود اور مولانا نورانی بھی ڈھاکہ گئے تھے۔ یکم مارچ کو جب ہماری پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا آدھا اجلاس ختم ہوا تو ہم دوپہر ایک بجے کھانا کھانے شاد باغ ہوٹل آ گئے۔ دوسرے سیشن کے لیے ہمیں سہ پہر تین بجے پھر جانا تھا۔ وقفے کے دوران یہ خبر ہم تک پہنچی کہ 3 مارچ کا قومی اسمبلی کا اجلاس جنرل یحییٰ خان نے ملتوی کر دیا ہے۔ اب ہمارے ہوٹل کے بیرے جو کہ بہت خوش تھے کہ حکومت مجیب الرحمٰن کو ملے گی اور مغربی پاکستان سے لوگ آئیں گے اور انہیں خوب ''ٹپ'' ملے گی۔ مگر بدلے ہوئے حالات سے وہ مایوس ہو گئے۔ ان کے چہروں پر غم و غصہ دیکھ کر ہمیں خوف آنے لگا، اسی اثنا میں ہم نے محسوس کیا کہ ہوٹل کے باہر شور شرابا ہو رہا ہے، دیکھا تو لوگ بڑی تعداد میں جمع ہو رہے تھے۔ وہ قومی اسمبلی کے اجلاس کے التوا کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے۔ جس کے پاس جو تھا وہ لے کر سڑکوں پر نکل آیا تھا۔ بانس، لاٹھی، سریا، فضا میں لہرائے جا رہے تھے۔

رات 9 بجے ہمیں گولی چلنے کی آواز آئی۔ فوج لوگوں پر گولیاں برسا رہی تھی اور بڑی تعداد میں نہتے لوگ مارے جا رہے تھے۔ آدھ، پون گھنٹہ خاموشی رہتی، اس کے بعد پھر لوگوں کا ایک اور جتھا آ جاتا۔ وہ نعرے لگاتے، وہ مجیب الرحمٰن کی حکومت چاہتے تھے۔ وہ فوج کو نہیں چاہتے تھے۔

ہم شاد باغ ہوٹل میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ ہم دو ایک روز وہاں رکے، ہماری واپسی کا مسئلہ تھا۔ میرے علاوہ شمیم اشرف ملک، ڈاکٹر اعزاز نذیر بھی تھے۔ مولانا مفتی محمود، مولانا نورانی اور سردار شوکت حیات اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ خیر پھر تین مارچ کو ہمارے لیے ہوائی جہاز میں انتظام ہو سکا اور ہم واپس لاہور آ گئے۔ لاہور آ کر بھی ہم جلوس نکالتے رہے۔ ہمارا مطالبہ تھا کہ اسمبلی کا اجلاس بلاؤ ہمارے

ساتھ اصغر خان سمیت تیس چالیس افراد اور بھی تھے جو لاہور میں واویلا کرتے تھے، باقی سارے مجیب الرحمٰن کے خلاف تھے۔ (فضا بھی ایسی ہی بنادی گئی تھی) انہی دنوں کسان ہال لاہور میں ''ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس'' کی جانب سے ایک جلسہ ہوا۔ وہاں میں نے کہا ''پولیس والو! میرا بیان لکھ لو کہ اس وقت چپ رہنا بددیانتی ہے، اور جیل سے باہر رہنا بے غیرتی ہے کیونکہ جنرل یحییٰ، نورالامین اور ان کے ساتھی ملک توڑ رہے ہیں'' اس کے بعد میں نے یہ مصرعے پڑھے۔

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

یہ پڑھ کر میں جلسہ ختم ہونے پر باہر نکلا تو پولیس مجھے گرفتار کر کے لے گئی اور جیل میں ڈال دیا۔ بھٹو صاحب اور ان کی پارٹی ہمارے نظریئے کے خلاف جلسے کر رہے تھے۔ وہ اسمبلی سے باہر بات کرنا چاہتے تھے۔''

اور پھر مشرقی پاکستان میں فوج نے اپنے ہی لاکھوں ہم وطن مار ڈالے اور جالب کی بات سچ نکلی اور ہم نے بنگال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ جالب نے اس خون ریزی پر یوں آنسو بہائے۔

بگیا لہولہان

ہریالی کو آنکھیں ترسیں، بگیا لہولہان
پیار کے گیت سناؤں کس کو شہر ہوئے ویران
بگیا لہولہان
ڈستی ہیں سورج کی کرنیں، چاند جلائے جان
پگ پگ خوف کے گہرے سائے، جیون موت سمان
چاروں اور ہوا پھرتی ہے، لے کر تیر کمان
بگیا لہولہان

چھلنی ہیں کلیوں کے سینے، خون میں لت پت پات
اور نجانے کب تک ہوگی، اشکوں کی برسات
دنیا والو! کب بیتیں گے دکھ کے یہ دن رات
خون سے ہولی کھیل رہے ہیں، دھرتی کے بلوان
بگیا لہولہان

بہر حال ملک دولخت ہوگیا، جالب کو بنگال کے ساتھی، دوست بہت یاد آتے تھے۔ ہر دردمند دل رکھنے والے کی طرح جالب بھی ملک ٹوٹنے پر بہت غمزدہ تھا۔ لاکھوں انسانوں کا ایک بار پھر مارے جانا تاریخ کا بہت بڑا دکھ تھا۔ 1947 میں بھی لاکھوں انسان مارے گئے تھے۔ اقتدار مجیب الرحمٰن کا حق تھا اسے دے دیا جاتا تو اس قدر انسانی خون نہ بہتا۔

خیر نئے پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی اور ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان بن گئے۔ مگر جالب کی جیل یاترائیں جاری رہیں۔ جالب کی پارٹی ''عوام'' تھے اور عوام اگر خوش نہیں تو جالب جیل سے باہر کیسے رہ سکتا تھا۔ جالب نے اپنی پارٹی نیشنل عوامی پارٹی کے ٹکٹ پر لاہور سے صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑا، مگر ذوالفقار علی بھٹو کی بے پناہ عوامی مقبولیت کے سامنے جالب ہار گیا۔ اس زمانے میں ایک نیا اخبار نکلا تھا جس کا نام ''آزاد'' تھا حمید اختر اور آئی اے رحمان اس اخبار کے روحِ رواں تھے۔ ''آزاد'' نے یوں خبر لگائی تھی ''سیاست جیت گئی، شاعر ہار گیا'' ہندوستان کے اداکار اور دانشور بلراج ساہنی نے اپیل کی تھی کہ ''جالب کے سامنے سے پیپلز پارٹی کا امیدوار ہٹا لیا جائے'۔ خیر سید محمد تقی نے ٹیلی ویژن پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا ''حبیب جالب کا ہارنا بہت تکلیف دہ امر ہے۔'' بھٹو، جالب کو قومی اسمبلی کا ممبر بنانا چاہتے تھے مرکزی وزارت دینا چاہتے تھے مگر جالب نے اسمبلی اور وزارت کو رد کرتے ہوئے ''ریگل چوک'' کو ترجیح دی عوام کو ترجیح دی۔ جالب کو یہی فیصلہ کرنا تھا اور یہی درست فیصلہ تھا، بھٹو کے ''طوفان'' کے مقابل چراغ جلانا، دیوانہ ہی یہ کام کر سکتا ہے اور جالب نے ایسا کر دکھایا۔ جالب قول و فعل کا سچا تھا اس نے کہا تھا اور اپنا کہا اسے یاد بھی تھا سو وقت آیا تو اس نے کر دکھایا۔

نہ ڈگمگائے کبھی ہم وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

بھٹو دور بھی جالب کے حوالے سے تلخ رہا، مگر میں ان واقعات کو نہیں دھراؤں گا کہ بھٹو صاحب نے جس پامردی کے ساتھ اپنی جان دی اور پھانسی کے پھندے کے ساتھ تختہ دار پر جھول گئے اور تاریخ میں امر ہو گئے اور لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہ گئے۔ اس دھرتی پر مسلط ہونے والے بدترین فوجی آمر جنرل ضیاء الحق نے جس جرم میں بھٹو صاحب کو پھانسی دی جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ جالب نے اس قتل کے بارے میں لکھا تھا۔

بھٹو کی پھلی برسی پر

ہاتھ کس کا پسِ عدالت تھا
دار پر کس نے اس کو کھنچوایا
ایک ہی ''مجرمِ زمانہ'' ہے
اُس پہ الزام تک نہیں آیا
یوں بھی ہوتا ہے خوں بہا لے کر
بخش دیتے ہیں لوگ قاتل کو
دیکھ کر راستے میں چھاؤں گھنی
بھول جاتے ہیں، اپنی منزل کو

بھٹو صاحب کی حکومت پر شب خون مارتے ہوئے فوج اس بدنصیب ملک پر تیسری مرتبہ بشکل جنرل ضیاء الحق پھر قابض ہوگئی اور ملک پر چھائی ہوئی رات کا فاصلہ طویل ہوگیا۔ جنرل ضیاء الحق نے جس قدر ملک کو نقصان پہنچایا اسے تباہ برباد کیا۔ اس کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی، 'کلاشنکوف' اور 'ہیروئن' اسی دور کی نشانیاں ہیں جن کے عذاب آج بھی قوم جھیل رہی ہے۔ یقیناً جالب کو ابھی اور امتحان دینا تھے جالب کی داستان میں کچھ اور رنگ ابھی بھرنا تھے اور جالب بھی اپنی روایات کے مطابق سینہ ٹھونک کر جنرل ضیاء کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ابتداء میں جالب کو

گھیرنے کی ناکام کوششیں کی گئیں، مگر کس قدر نا سمجھ بے عقل لوگ تھے جو اللہ کے بنائے ہوئے اس ''خاص بندے'' حبیب جالب سے یکسر ناواقف تھے۔ میں سمجھتا ہوں اور اکثر گفتگو کرتے ہوئے کہا کرتا ہوں کہ حبیب جالب جیسے بندوں کو اللہ اپنے اوصاف عطا کر کے دنیا میں بھیجتا ہے تاکہ دنیا والے اللہ کی واحدنیت کو مانیں کہ ''اگر وہ چاہے تو عام بندوں جیسے نظر آنے والے ''بندے'' کو سب میں ممتاز کر دے'' حبیب جالب کی شخصیت میں بھی خدائی صفت ''بے نیازی'' کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اللہ نے ان کا وجود اپنی اس صفت کے خمیر سے گوندھا تھا اور ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے ساری زندگی بے نیازانہ گزاری ہے۔ ہر حکومت نے ان کے سامنے Blank Cheque رکھا کہ جتنا چاہو لکھ لو اور وہ کمال بے نیازی سے ایسی ہر پیشکش کو ٹھوکروں سے اڑا دیتے تھے، گھر میں بھوک تھی، بچے بھوکے تھے، بلا کی غربت نے گھر میں ڈیرے ڈال رکھے تھے مگر اس خاک نشیں کی ٹھوکر میں زمانہ تھا اور اسی لیے جالب برسرِ محفل و جلسہ کہا کرتے تھے ''اتنا لوگوں نے حاصل نہیں کیا، جتنا میں نے ٹھکرایا ہے'' بھٹو جیسا لیڈر، جالب صاحب کا دیوانہ تھا، ایوب دور میں جالب صاحب ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار ہوئے شفقت تنویر مرزا کی سربراہی میں لاہور کے جمہوریت پسند ادیبوں شاعروں نے جالب کے گھر والوں کے لیے فنڈ قائم کیا اور پاک ٹی ہاؤس کے بیرے الٰہی بخش کو سیکرٹری بنایا۔ بھٹو صاحب خود پاک ٹی ہاؤس آئے اور الٰہی بخش کا پتہ کیا۔ الٰہی بخش بھاگتا ہوا باہر آیا بھٹو صاحب نے اس سے ہاتھ ملایا (اور ایک عرصہ تک الٰہی بخش کسی سے ہاتھ نہیں ملاتا تھا کہ اس سے بھٹو صاحب نے ہاتھ ملایا تھا) اور ساڑھے چار سو روپے جالب فنڈ میں دیے۔ بھٹو اکثر جالب کی تلاش میں کافی ہاؤس بھی آنکلتے تھے۔ ایک بار بھٹو صاحب کافی ہاؤس آئے تو شاعر جاوید شاہین آگے بڑھ کر ان سے ملے، بھٹو صاحب نے جالب صاحب کے بارے میں پوچھا، تو جاوید شاہین نے کہا ''آپ کہیں تو ہم جالب صاحب کو ڈھونڈ کر لے آتے ہیں'' مگر بھٹو صاحب نے کہا ''نہیں میں خود ہی انہیں ڈھونڈ لوں گا'' بھٹو اور جالب کی باتیں، چند واقعات یاد آ رہے ہیں۔ ایک بار جالب صاحب نے

70 کلفٹن (کراچی) فون کیا تو بھٹو صاحب کے خاص ملازم نُورا نے فون اٹھایا، جالب صاحب نے پوچھا ''بھٹو صاحب کہاں ہیں انہیں بلاؤ'' تو نورا بولا ''صاحب اندر ہیں'' اس پر جالب صاحب نے کہا ''ارے ابھی تو باہر آئے تھے، پھر اندر ہو گئے'' فون کے بارے میں بھٹو صاحب نے باتھ روم سے ہی پوچھا ''نورا کون ہے'' تو نُورا نے جالب صاحب کا بتایا اور بھٹو تولیہ باندھ کر فون سننے کے لیے باتھ روم سے باہر آ گئے۔

ایک اور واقعہ ہے یہ بھی 70 کلفٹن (کراچی) ہی پر وقوع پذیر ہوا۔ جالب صاحب موجود تھے۔ پیپلز پارٹی کے اکثر سینئر رہنما بھی موجود تھے۔ بھٹو صاحب نے جالب صاحب سے اپنا کلام سنانے کے لیے کہا۔ جالب صاحب نے اپنی مشہور نظم ''پاکستان کا مطلب کیا'' سنائی اور جب وہ ان مصرعوں پر پہنچے کہ ؎

کھیت وڈیروں سے لے لو
ملیں لٹیروں سے لے لو
ملک اندھیروں سے لے لو
رہے نہ کوئی عالی جاہ
پاکستان کا مطلب کیا؟
لا الٰہ الا اللہ

یہ شاعری سن کر سندھ کے ایک بڑے جاگیردار (جو پیپلز پارٹی کے سینئر عہدیدار بھی تھے) اٹھ کر چلے گئے۔ اس صورتِ حال میں بھٹو صاحب نے جالب صاحب کے کان میں کہا ''یار جالب! موقع محل تو دیکھ لیا کرو سندھ کا سب سے بڑا وڈیرہ بیٹھا تھا اور تم نے ''کھیت وڈیروں سے لے لو'' پڑھ دیا'' بھٹو صاحب کی بات کا جواب جالب صاحب نے بلند آواز میں دیتے ہوئے کہا ''بھئی بھٹو صاحب! میرا پروگرام تو ''لے لو'' کا ہی ہے، اب یہ تو میں نہیں کر سکتا کہ کوئی وڈیرہ موجود ہو تو میں کہوں ''کھیت وڈیروں کو دیدو'' تو بھٹو صاحب یہ تو شاعری ہے اور شاعری تبدیل نہیں ہوتی۔''

پیپلز پارٹی کے قیام کے بالکل اوائل دنوں میں بھٹو صاحب اور جالب صاحب کی لاہور میں بھی بہت ملاقاتیں رہیں بھٹو صاحب فلیٹیز ہوٹل میں ٹھہرتے تھے۔ کافی ہاؤس لاہور آمد کے بعد جالب صاحب بھی بھٹو صاحب کے پاس ملاقات کے لیے چلے جاتے تھے، پیپلز پارٹی کے قیام کا ابھی دور دور کوئی ذکر نہیں تھا۔ کہ جب بھٹو صاحب نے جالب صاحب سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ انہیں نیشنل عوامی پارٹی کا جنرل سیکرٹری بنا دیا جائے۔ آیئے جالب سے سنتے ہیں:

(35) ''ایوب خان کا عہد میرے دل و دماغ پر ایک سزا کے طور پر گزرا ہے۔ وہ ایک ''عہدِ سزا'' تھا۔ ہماری پارٹی (نیپ) دونوں طرف مغربی پاکستان کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان میں بھی تھی۔ جبکہ مجیب الرحمٰن پورے مشرقی پاکستان میں جیتا تھا۔ اس وقت نیشنل عوامی پارٹی کا ایک ایم پی اے وہاں سے بھی بنا تھا۔ نیپ خیال کے حوالے سے ذہین لوگوں کے لیے بڑی قابلِ قبول تھی۔ ایک دفعہ بھٹو نے میرے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ''مجھے نیشنل عوامی پارٹی میں لے چلو اور اس کا جنرل سیکرٹری بنا دو'' میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ یہ پارٹی جمہوری پارٹی ہے اس میں یونہی آدمی سیکرٹری یا صدر نہیں بن سکتا۔ آپ سال سوا سال اس میں رہیں۔ عوام سے رابطہ کریں پارٹی کے لوگوں سے ملیں وہ آپ سے متاثر ہو جائیں تو پھر ہم صوبوں سے ایک ایک عہدیدار لیتے ہیں۔ پنجاب سے اگر سیکرٹری ہے تو صدر دوسرے صوبوں سے ہوتا ہے۔ آپ کے لیے ہم فضا بنائیں گے۔ یہ بات فلیٹیز ہوٹل میں ہوئی تھی پھر ہوٹل سے کار میں بیٹھ کر میں اور بھٹو صاحب میاں محمود علی قصوری کی کوٹھی پر آئے۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ بھٹو صاحب ہماری پارٹی میں آ جائیں گے تو ایک ڈیموکریٹ بن جائیں گے۔ ان کی وجہ سے ہماری پارٹی بھی پھیلے گی۔ مگر جب ہم میاں قصوری کی کوٹھی میں داخل ہوئے تو میاں صاحب ''ہمیں عادتاً سی آر اسلم اور سردار شوکت علی کے حوالے کر کے اندر چلے گئے۔ گفتگو شروع

ہوگئی۔ سی آر اسلم اور سردار شوکت علی نے کہا کہ ''خارجہ پالیسی ایوب خان کی بہت اچھی ہے'' بھٹو صاحب نے کہا کہ ''چین سے دوستی کی پالیسی تو میں نے بنائی تھی، ایوب خان کو اس کا کیا پتہ''

سی آر اسلم اور سردار شوکت علی اس بات کو رد کرتے رہے اور وہ جو میں نے خواب دیکھا تھا کہ بھٹو پارٹی میں آئیں گے اور پارٹی پھلے پھولے گی وہ خواب ٹوٹ گیا، میں نے کہا ''بھٹو صاحب میں چلا، میرے سر میں درد ہو رہا ہے، تو بھٹو صاحب نے باآواز بلند کہا ''بیٹھو'' خورشید محمود قصوری میرا سر دبانے لگا۔ یہ بات بن نہ سکی اور میاں محمود علی قصوری جب باہر آئے تو بات بگڑ چکی تھی۔ ہوٹل واپسی پر بھٹو صاحب نے مجھ سے کہا کہ ''آپ کی پارٹی کے لوگوں میں کوئی پروماسکو ہے کوئی پروچائنا، اب کیا کیا جائے میں نے ان سے کہا کہ ''آپ اپنی پارٹی بنائیں'' جمہوریت کے لیے ہم کوئی متحدہ محاذ بنالیں گے۔''

اور پھر پیپلز پارٹی بن گئی۔ جنرل ضیاء نے اقتدار پر قبضہ کیا اور وقت کے کاسہ لیسوں نے اپنی اپنی ڈیوٹیاں سنبھال لیں، ٹیلی ویژن والوں نے دو تین بندے جالب کے پیچھے لگا دیے وہ کیمرے اٹھائے کبھی پاک ٹی ہاؤس تو کبھی جالب کے گھر کے چکر لگانے لگے، وہ کہتے تھے ''جالب صاحب! بھٹو دور میں آپ پر بھی بڑے مظالم ہوئے ہیں۔ آپ نے قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ لہٰذا آپ ٹیلی ویژن کے پروگرام ''ظلم کی داستانیں'' کے لیے اپنی کہانی ریکارڈ کروا دیں اور جواباً شاعر کہتا ''میرے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہوا، اور تم بھاگ جاؤ۔'' ویسے اس پروگرام ''ظلم کی داستانیں'' میں بڑے بڑے نامور سیاست دان اور پیپلز پارٹی کے سابقہ لوگ بھی بہہ گئے۔

جنرل ضیاء نے آتے ہی آئین کو اٹھایا اور پھر کہا ''یہ کوئی آسمانی صحیفہ نہیں ہے۔'' اسلام کا نام لے کر جنرل ضیاء نے تیسرے فوجی حکومتی سفر کا آغاز کر دیا اور جالب ضیا جیسے خوفناک فوجی آمر کو ختم کرنے کے جنون میں مبتلا ہوگیا۔

1978 میں جالب صاحب پچاس سال کے ہو گئے تو لاہور کے ادیبوں شاعروں نے جالب کی پچاسویں سالگرہ منانے کا پروگرام بنایا۔ اس موقع پر جالب کے حوالے سے ایک کتاب بھی شائع کرنے کا منصوبہ بنا پورا بھی ہوا۔ 160 صفحات پر مشتمل کتاب کا نام (36) ''حبیب جالب فن اور شخصیت'' تجویز ہوا۔ اور اس کتاب کا ٹائٹل، بین الاقوامی شہرت کے حامل مصور صادقین نے خود کہہ کر بنایا اور جالب کے ایک قطعہ کی خطاطی بھی کی۔ قطعہ سن لیجئے، پھر آگے بڑھتے ہیں۔

دُشمنوں نے جو دُشمنی کی ہے

دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

خامشی پر ہیں لوگ زیرِ عتاب

اور ہم نے تو بات بھی کی ہے

اس کتاب کے پرنٹر شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور تھے اور کتاب کے پرنٹ لائن صفحہ پر لکھا ہے'' اس کتاب کو لاہور کے اہلِ قلم حضرات نے مرتب اور شائع کیا'' جی چاہ رہا ہے کہ اس تاریخی صحیفے کے کاتب کا نام بھی لکھ دوں اور نام ہے محمد یونس اور کتاب کی تزئین ذوالفقار تابش صاحب نے کی ہے۔ کتاب کے مختصر فلیپ میں تحریر ہے'' حبیب احمد مست کو ابنِ انشاء نے حبیب جالب بنایا اور صادقین نے کیفے چارج (کراچی) کے باہر'' اکھیاں ملا کے جیا بھرما کے چلے نہیں جانا'' جھوم جھوم کے گانے شوخ و شنگ جوان سے پوچھا جواب ملا شاعری اور صادقین نے اس تاثر کے ساتھ اس کی پہلی کتاب ''برگِ آوارہ'' کا ٹائٹل بنانے سے گریز کیا۔ مگر صادقین نے خود کہہ کر ''حبیب جالب۔ فن اور شخصیت کا ٹائٹل بنایا۔ یہ ہے زمان و زیبی کا فرق کہ جو حبیب جالب اور صادقین کے نظریات اور فلسفے میں اس پچیس برس میں پیدا ہوئے۔ بقول احمد ندیم قاسمی ''حبیب جالب چاہتا تو اپنی انفرادیت کا سودا کر لیتا'' بقول ڈاکٹر وزیر آغا'' وہ چاہتا تو اپنی جبلت کو مسخ کر لیتا۔'' بقول عبداللہ ملک'' وہ چاہتا تو سامراج کی اینٹوں کا گارا بن کر اپنے لیے راج محل تعمیر کر لیتا۔'' بقول فارغ بخاری'' جالب اختر شیرانی کی طرح رومانوی شاعر کی حیثیت سے بہت مقبول ہوتا اور زر کی یافت کو منزلِ جاناں بنالیتا اور تمام اہل قلم میں اپنے اصولوں کو مصلحت کے غلاف میں

لپیٹ کر آتشدان پر موہنجودڑو کے آثار کی شکل میں آراستہ کر کے آپ سے پوچھتا کہ ''انقلاب کا رہنما مجھے مانتے ہو کہ نہیں'' مگر نہیں کہ حبیب جالب کو عسرت اور فاقہ کشی کے خارزار کی دولت ہی عزیز ہے اور ہمیں حبیب جالب عزیز ہے کہ ان صفحات کا خراج صرف اس کے فن کو سلام ہے۔

''آزمائش حرف'' کے عنوان سے ایک مختصر تحریر بطور تعارف کتاب کے ابتداء میں شامل ہے اسے بھی پڑھنا ضروری ہے۔ ''حبیب جالب کے فن اور شخصیت پر مقالوں کا یہ مجموعہ حبیب جالب کی پچاسویں سالگرہ کی رعائیت سے مرتب کیا گیا ہے۔ روئے زمین پر سانس لینا اور شہرِ روز و شب میں وقت گزار لینا تو ہر کس و نا کس کا کام ہے مگر صلیب و دار کی آزمائش میں سر سلامت رکھتے ہوئے آگے بڑھنا اور پھر بھی اپنے اصولوں کی فصل آپ ہی کاٹنا صرف ان لوگوں کے حصے میں آتا ہے کہ جو توشہء و جاں کو منت غیر سے ناآشنا رکھتے ہیں۔ حبیب جالب کے فن اور شخصیت پر لکھنے والوں کی تخصیص بڑا ہی مشکل کام تھا، ظاہر ہے لاکھوں کے جلسوں میں نظم پڑھنے والے کو ٹوکری اٹھانے والے سے لے کر دبیز پردوں کی تہہ میں پائپ کے سہارے شناخت ہونے والے وہ افراد بھی جانتے تھے کہ جو شعر سن کر 'very nice' کا نعرہ مستانہ بلند کرتے ہیں۔ مزید ستم یہ تھا کہ جالب تو مظلوم کا نمائندہ اور شاعر تھا۔ وقت بڑا ظالم ہے پلک جھپکتے ہی تاریخ کا ورق پلٹ کر بساطِ شہ پلٹ دیتا ہے۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ جالب پر لکھنے والوں نے اس مختصر وقت میں جالب پر خلوص و اعتماد کے ساتھ جو لکھا وہ شاملِ اشاعت ہے۔ فیض صاحب ملک سے باہر تھے اس لیے ان کی تحریر اس قبیلے میں موجود نہیں مگر ان کی تحریک پر یہ کتاب مرتب ہوئی۔''

اس کتاب میں جن اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں ان کے نام ہیں سبط حسن، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، فارغ بخاری، انتظار حسین، عبداللہ ملک، محمد خالد اختر، محسن احسان، سلیم اختر (اب ڈاکٹر) اصغر ندیم سید، حسن رضوی، شاہد شیدائی، کتاب میں سلیم شاہد، شاہد شیدائی، حسن رضوی، نجیب احمد اور مظفر وارثی (معروف شاعر ہیں) کی نظمیں شامل ہیں۔ کتاب میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، قسور گردیزی اور امین مغل کے لکھے ہوئے دیباچے

بھی شامل ہیں اور چند صفحات پر 'کلام جالب' جالب کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر جناب احمد ندیم قاسمی کی صدارت میں مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا جس کی روحِ رواں محترمہ کشور ناہید تھیں۔

تیسرا فوجی آمر جنرل ضیاء، اسلام، اسلام کی تسبیح کرتے ہوئے اپنے ''بوٹ'' مضبوطی سے جما رہا تھا اور جالب اپنے محاذ پر چوکنا تھا کہ ایسے میں پاکستان کے ''ہائیڈ پارک'' کراچی پریس کلب کی گورننگ باڈی نے حبیب جالب کو کلب کی تاحیات اعزازی رکنیت دینے کا فیصلہ کیا اور بذریعہ خط جالب صاحب کو مطلع کیا کہ ''25 ردسمبر 1980 کو شام چار بجے ایک جلسہ عام میں آپ کو پریس کلب کی تاحیات رکنیت دی جائے گی۔ پریس کلب کے صدر عبدالحمید چھاپرا صاحب نے خط میں مزید درخواست کی تھی کہ ''آپ تازہ نظم لکھ کر لائیں''۔

اس شام میں پریس کلب کراچی میں موجود تھا۔ 25 ردسمبر کی یخ بستہ شام، پریس کلب کے پچھواڑے (Back yard) جلسہ کا اہتمام تھا۔ پورا میدان کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ لوگ پریس کلب کی بیرونی دیوار پر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جلسے کی صدارت ہم سب کے ہر دل عزیز دانشور سبط حسن کر رہے تھے، اس شام سعیدہ گزدر نے مضمون پڑھا تھا اور انعام درانی صاحب نے جالب صاحب کے لیے نظم سنائی تھی، پروگرام کی ابتداء کرتے ہوئے اسٹیج سیکرٹری مجاہد بریلوی نے کلب کے صدر عبدالحمید چھاپرا اور سیکرٹری ظفر قریشی سے کہا کہ وہ اسٹیج پر آ کر حبیب جالب کی خدمت میں کلب کا نشان (شیلڈ) اور تاحیات رکنیت پیش کریں، تالیوں کی گونج میں یہ تاریخی واقعہ وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ سبط حسن صاحب بھی صدر اور سیکرٹری پریس کلب کے ساتھ تھے۔ پروگرام کے آخر میں جالب صاحب کو زحمتِ کلام دی گئی۔ یہ وہی دن تھا، وہی تاریخ اور وہی شام کہ جب دارالخلافہ اسلام آباد میں حکومت کی سرپرستی میں ''اکیڈمی آف لیٹرز'' (اکادمی ادبیات) کا افتتاحی اجلاس ہو رہا تھا۔ جالب اور چند اور خالد علیگ جیسے شاعروں کو چھوڑ کر باقی تمام جنرل ضیاء الحق کے حضور موجود تھے۔ اور جنرل، رعونت سے بول رہا تھا ''اس ملک کی فضائیں، اس کی چاندنی، ایسے شاعروں کے لیے حرام ہیں جو ملک کے خلاف سوچتے ہیں، کام کرتے ہیں''

اور جالب صاحب نے جنرل ضیاء کی ان باتوں کا جواب دیتے ہوئے تین اشعار کہے تھے

وہ کہہ رہے ہیں محبت نہیں وطن سے مجھے
سکھا رہے ہیں محبت مشین گن سے مجھے
میں بے شعور ہوں، کہتا نہیں ستم کو کرم
یہی خطاب ملا، ان کی انجمن سے مجھے
میسر جو شہ کی ہے، عاصبوں کے کام آئے
خدا بچائے رکھے، ایسے علم و فن سے مجھے

خیر یہ تین اشعار کا ذکر درمیان میں آ گیا، آیئے پریس کلب کراچی چلتے ہیں، جہاں سے اسلام آباد سے ہزار میل دور بحرہ عرب کے ساحل پر عوام کے شاعر حبیب جالب کو پکارا جا رہا تھا۔ مجاہد بریلوی کہہ رہا تھا" آیئے جالب صاحب اور پھر سامعین سے مجاہد بریلوی نے کہا" اور میں سامعین سے کہوں گا کہ کھڑے ہو کر جالب صاحب کا استقبال کریں، اور آپ کی تالیوں کی گونج اسلام آباد کے ایوانوں تک پہنچنا چاہیے" اور پھر جالب صاحب یوں گویا ہوئے" جناب سبط حسن صاحب، انعام درانی صاحب، جنہوں نے میرے بارے میں بڑی خوبصورت نظم پڑھی، سعیدہ گزدر صاحبہ نے مضمون پڑھا، میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں اور خاص طور پر کراچی پریس کلب کا کہ جنہوں نے مجھے یہ عزت بخشی اور اپنا رکن بنالیا بہر حال میں شکریہ ادا کرتا ہوں، بھئی اب تقریر تو مجھے آتی نہیں ہے" اس پر سبط بھائی بولے" شعر پڑھیے جالب صاحب" اور جواباً جالب مسکرائے اور سامعین کی طرف دیکھتے ہوئے بولے، سبط صاحب کا حکم ہے کہ میں شعر سناؤں اور اب رات بھی خاصی ہو چکی ہے اور سردی بھی ہے تو میں سب سے پہلے تازہ نظم سناؤں گا۔ جس کے لیے عبدالحمید چھاپرا صاحب نے بھی مجھے خط کے ذریعے کہا تھا کہ" تازہ کلام لکھ کر لایئے گا تو میں تازہ نظم پیش کرتا ہوں اور پھر جالب صاحب نے ترنم کے ساتھ یوں آغازِ کلام کیا، (یہ نظم پہلی بار جالب صاحب پڑھ رہے تھے اور نظم کے دوران سامعین کا جوش اور نعرے قابلِ دید منظر تھا) ۔

ظلمت کو ضیاء، صر صر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو گہر، دیوار کو در، کرگس کو ہما کیا لکھنا

اک حشر بپا ہے گھر گھر میں، دم گھٹتا ہے گنبدِ بے در میں
اک شخص کے ہاتھوں مدت سے رسوا ہے وطن دنیا بھر میں
اے دیدہ ورو، اس ذلت کو قسمت کا لکھا کیا لکھنا
یہ اہلِ حشم، یہ دارا وجم، سب نقش برآب ہیں اے ہمدم
مٹ جائیں سب پروردہءِ شب، اے اہلِ وفا رہ جائیں گے ہم
ہوجاں کا زیاں پر قاتل کو معلوم ادا، کیا لکھنا
ظلمت کو ضیاء صر صر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا

لوگوں ہی پہ ہم نے جاں واری، کی ہم نے انہی کی غم خواری
ہوتے ہیں تو ہوں یہ ہاتھ قلم، شاعر نہ بنیں گے درباری
ابلیس نما انسانوں کی اے دوست ثنا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیاء صر صر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا

حق بات پہ کوڑے اور زنداں، باطل کے شکنجے میں ہے یہ جاں
انساں ہیں کہ سہمے بیٹھے ہیں، خونخوار درندے ہیں رقصاں
اس ظلم و ستم کو لطف و کرم اس دکھ کو دوا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیاء صر صر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا

ہر شام یہاں شامِ ویراں، آسیب زدہ رستے گلیاں
جس شہر کی دھن میں نکلے تھے، وہ شہر دلِ برباد کہاں
صحرا کو چمن، بن کو گلشن، بادل کو ردا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیاء صر صر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا

اے میرے وطن کے فنکارو، ظلمت پہ نہ اپنا فن وارو
یہ محل سراؤں کے باسی، قاتل ہیں سبھی اپنے یارو
ورثے میں ہمیں یہ غم ہے ملا، اس غم کو نیا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیاء صر صر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا

اس روز جالب صاحب نے زیادہ تر اپنا تازہ کلام سنایا، یہ نظم بھی پہلی بار وہاں سنائی گئی ۔

فرنگی کا جو میں دربان ہوتا
تو جینا کس قدر آسان ہوتا
مرے بچے بھی امریکہ میں پڑھتے
میں ہر گرمی میں انگلستان ہوتا
مری انگلش بلا کی چست ہوتی
بلا سے جو نہ اردو دان ہوتا
جھکا کے سر کو ہوجاتا جو سر میں
تو لیڈر بھی عظیم الشان ہوتا
زمینیں میری ہر صوبے میں ہوتیں
میں واللہ صدرِ پاکستان ہوتا

نظم کے اختتام پر کرسی صدارت پر بیٹھے سبط حسن صاحب ازراہِ تفنن جالب صاحب سے بولے ایک قافیہ رہ گیا ''شیطان ہوتا'' اس پر جالب صاحب بہت محظوظ ہوئے اور مسکراتے ہوئے سامعین کو شامل کرتے ہوئے بولے ''سبط صاحب کہہ رہے ہیں کہ ایک قافیہ رہ گیا ''شیطان ہوتا،، اس دن جالب صاحب نے 25 دسمبر (یوم پیدائش قائدِ اعظمؒ) کے حوالے سے اپنی تازہ فکر انگیز نظم بھی سنائی۔

قائداعظمؒ دیکھ رہے ہو اپنا پاکستان

تم نے کہا تھا، اب نہ چلے گا محلوں کا دستور
بنے گا وہ قانون جو ہوگی بات ہمیں منظور
ہر اک چہرے پر چمکے گا، آزادی کا نُور
لیکن ہم کو بیچ رہا ہے اک جابر سلطان
قائدِ اعظمؒ دیکھ رہے ہو، اپنا پاکستان

کتنے سر کٹوا کر ہم نے ملک بنایا تھا
دار پہ چڑھ کر آزادی کا گیت سنایا تھا
اس دھرتی سے انگریزوں کو دور بھگایا تھا
اس دھرتی پر آج مسلط ہیں، ان کے دربان
قائدِ اعظمؒ دیکھ رہے ہو، اپنا پاکستان

جنگ چھڑے تو ہم نردھن ہی ان کے بنک بچائیں
دولت والے مری میں بیٹھے تھر تھر کانپے جائیں
ملک کی خاطر ہم اپنے سینوں پر گولی کھائیں
پھر بھی بھوکے ننگے بابا، ہم مزدور کسان
قائدِ اعظمؒ دیکھ رہے ہو، اپنا پاکستان

اس یادگار تقریب کے بعد جالب صاحب کراچی سے واپس لاہور چلے گئے۔ 16 رجنوری 1981 کو ہمارے والد صاحب کا ملتان میں انتقال ہو گیا۔ جالب صاحب کا ملتان میں داخلہ بند تھا، بھائیوں میں، میں اکیلا ہی والد صاحب کے ساتھ تھا۔ ابا نشتر ہسپتال ملتان میں تین روز ''کومے'' میں رہے اور پھر انتقال کر گئے۔ مجھ سے بڑے بھائی عبدالحمید خان کوئٹہ میں نیشنل بنک کی طرف سے آڈٹ کرنے گئے ہوئے تھے، بہر حال میں نے دونوں بڑے بھائیوں کو اطلاع دی، حمید بھائی بھی فوراً آ گئے اور جالب صاحب کا مسئلہ تھا کہ وہ ملتان میں داخل نہیں ہو سکتے تھے، خیر کچھ لوگ بیچ میں پڑے اور ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ جالب صاحب نمازِ جنازہ اور تدفین کے فوراً بعد ملتان سے چلے جائیں اور جالب صاحب نے ایسا ہی کیا۔ ہمارے ابا کی خواہش تھی کہ ولیوں کے شہر ملتان شریف میں انہیں جگہ نصیب ہو اور اللہ نے ان کی یہ خواہش اس حد تک پوری کی کہ انہیں اسی قبرستان میں جگہ ملی، جہاں سے غوث بہاوالحقؒ اور شاہ شمس سبزواریؒ کے گنبد صاف نظر آتے ہیں (یقیناً اللہ اپنے نیک بندوں ہی کی خواہشات پوری کرتا ہے ابا کی یہی خواہش تھی کہ ان کی قبر سے غوث بہاوالحقؒ اور شاہ شمسؒ کے مزار کے گنبد نظر آئیں)۔

جنرل ضیاء کے خلاف MRD کے نام سے متحدہ اپوزیشن کا اتحاد بن چکا تھا ایسے تمام بننے والے جمہوری محاذوں کے بانی نوابزادہ نصر اللہ خان ہی اس اتحاد کے بھی بانی تھے۔ MRD کے اعلان کے مطابق جیل بھرو تحریک شروع کی گئی اور تمام بڑے بڑے اپوزیشن لیڈر گرفتار ہو کر جیل چلے گئے۔ جالب بیان کرتے ہیں:

(37) ''ضیاء الحق کے کارندوں نے سب سیاسی لوگوں کو پکڑ لیا، عوامی جمہوری اتحاد

والوں کو بھی اور پی پی والوں کو بھی۔ ایم آر ڈی بن چکی تھی میاں محمود علی قصوری، ان کے لڑکے، اعتزاز احسن فلمی اداکار محمد علی، فیض صاحب کے داماد شعیب ہاشمی، سوشلسٹ پارٹی کے سی آر اسلم سب کو کوٹ لکھپت جیل بھیج دیا گیا۔ پولیس میری گرفتاری کے لیے گھر آئی تو میں موجود نہیں تھا۔ وہ میرے لڑکے کو لے جانے لگے تو میری بیوی نے مزاحمت کی اور اسے نہیں لے جانے دیا۔ پولس والے کہہ گئے ''جالب صاحب آئیں تو انہیں تھانے بھیج دیں'' میں صبح گھر آیا تو مجھے پتہ چلا۔ میں نے سوچا اب یہی بہتر ہے کہ تھانے چلا جاؤں اور میں خود ہی تھانے پہنچ گیا۔ تھانے والوں نے مجھے بٹھالیا اور کہا ''صاحب بات یہ ہے کہ آپ تو فوج کو مطلوب ہیں۔ ہماری طرف سے تو آپ جا سکتے ہیں'' میں نے سوچا کہ میں کیوں جاؤں اور مجھے نہیں جانا چاہیے۔ چلا گیا تو کوئی اور کیس بنا دیں گے۔ یوں میں تھانے میں ہی رہا۔ رات ہو گئی تو انہوں نے بستر بچھا دیا۔ اور میں لیٹ گیا۔ تقریباً ڈیڑھ بجے رات پولیس والے مجھے کوٹ لکھپت جیل لے گئے۔ وہاں تقریباً سبھی لوگ موجود تھے۔ باقی آہستہ آہستہ آتے بھی گئے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان بہاولپور میں نظر بند تھے اور پنجاب کے دوست مختلف جیلوں میں بند تھے،

یہاں بھی ملاقات کے وقت سی آئی ڈی والے موجود ہوتے تھے۔ ہم بڑے محتاط ہو کر ملاقاتی سے گفتگو کرتے تھے۔ اشارے کنایوں میں بے حد مشکل زندگی تھی، اور میں جیل میں تھا ایسے میں میری بیوی مجھ سے ملاقات کے لیے آ گئی بیوی کچھ گھر کے حالات بتانا چاہتی تھی کہ پیسے نہیں ہیں مگر وہ کچھ نہ کہہ پا رہی تھی۔ میں بھی بیوی سے نہیں کہہ پا رہا تھا کہ میرے فلاں دوست کے پاس چلی جاؤ اس سے فی الحال پیسے لے لو۔ نام لینے سے وہ دوست بھی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا تھا۔ اسی کیفیت کو میں نے بیان کرتے ہوئے کوٹ لکھپت جیل میں یہ غزل لکھی۔

ملاقات

جو ہو نہ سکی بات، وہ چہروں سے عیاں تھی
حالات کا ماتم تھا، ملاقات کہاں تھی
اس نے نہ ٹھہرنے دیا پہروں مرے دل کو
جو تیری نگاہوں میں شکایت مری جاں تھی
گھر میں بھی کہاں چین سے سوئے تھے کبھی ہم
جو رات ہے زنداں میں وہی رات وہاں تھی
یکساں ہیں مری جان قفس اور نشیمن
انسان کی توقیر یہاں ہے نہ وہاں تھی
شاہوں سے جو کچھ ربط نہ قائم ہوا اپنا
عادت کا بھی کچھ جبر تھا، کچھ اپنی زباں تھی
صیاد نے یوں ہی تو قفس میں نہیں ڈالا
مشہور گلستاں میں بہت میری فغاں تھی

ضیاء کا دور بہت خوفناک تھا یوں لگتا تھا جیسے ہم ساری زندگی جیل میں ہی سڑتے رہیں گے۔ ہم کوٹ لکھپت جیل میں تھے کہ معافی ناموں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ ''بانڈ سسٹم'' آیا حکومت نے کہا کہ جو معافی نامہ لکھ دے اور آئندہ کے لیے محتاط رہنے کا یقین دلائے۔ اسے جیل سے رہا کردیا جائے گا۔ میں نے اس کے خلاف نظم لکھ دی کہ۔

دوستو جگ ہنسائی نہ مانگو
موت مانگو رہائی نہ مانگو
عمر بھر سر جھکائے پھروگے
سب سے نظریں بچائے پھروگے
مل رہا ہے جو بارِ ندامت

دل پہ کیسے اٹھائے پھروگے
اپنے حق میں برائی نہ مانگو
موت مانگو، رہائی نہ مانگو

ہم ہیں جن کے ستم کا نشانہ
مت کہو، ان سے غم کا فسانہ
پھر کہاں جمگھٹا یہ میسر
بن آگیا ہے قفس آشیانہ
اب قفس سے جدائی نہ مانگو
موت مانگو، رہائی نہ مانگو

رات سے روشنی مانگنا کیا
موت سے زندگی مانگنا کیا
ظلم کی ظلمتوں سے مری جاں
جوت انصاف کی مانگنا کیا
غاصبوں سے بھلائی نہ مانگو
موت مانگو، رہائی نہ مانگو

یہ نظم جیل سے باہر چلی گئی اور پھر پورے ملک میں پھیل گئی اس کی سزا مجھے یہ دی گئی کہ مجھے میانوالی جیل بھیج دیا گیا اور وہاں پھانسی کی کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔ بڑی بھیانک جیل تھی۔ وہاں بعد میں راؤ رشید، چودھری اصغر خادم، امین مغل، جہانگیر بدر اور دوسرے لوگ بھی آگئے۔ شدید گرمی کا موسم تھا۔ ہم بنیان اور جانگیہ پہنے سلاخوں سے لگے ہوا کے ایک جھونکے کے منتظر رہتے تھے، ہمارے سامنے دیوار تھی جس کے ساتھ چھت ملی ہوئی تھی اور چھوٹے چھوٹے روشن دان بہت اوپر تھے، پنکھے کو ہوا لگتی تو ٹھنڈی ہوا آتی ورنہ پنکھا مسلسل گرم ہوا پھینکتا اس لیے اسے بند کرنا

پڑتا تھا۔ شدید تپش اور برا حال، سانس لینا بھی دوبھر ہوتا تھا۔

ایک دفعہ ہم جیل کے صحن میں بیٹھے تھے۔ یہ چھوٹا سا صحن تھا اس میں تھوڑی سی چھاؤں تھی۔ وہاں اسسٹنٹ جیل آ گیا اور ہمیں دیکھ کر بولا "جالب صاحب یہاں تو بڑے بڑوں کے کپڑے اتر جاتے ہیں" ہم بنیان، جانگیہ پہنے ہوئے تھے، میں نے جواب دیا "یہ بھی آپ کا حسنِ نظر ہے" پھر وہ کئی دن تک نہیں آیا۔ ایک دن ڈپٹی جیلر آیا اور بولا "ہمارے اعلیٰ افسران آپ کے بارے میں فکر مند رہتے ہیں، اور آپ کا پوچھتے رہتے ہیں۔ ہوم سیکرٹری اور ڈی سی بھی آپ کو جانتے ہیں" میں نے کہا کہ "میں کوئی سمگلر تو نہیں ایک شاعر ہوں۔" جیل کا میڈیکل آفیسر بھی ایک دن اپنے بچے کو لیکر آیا اور کہا کہ "میرا بچہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" بس یونہی جیل کے دن گزر رہے تھے کہ ایک دن جیلر صاحب آ گئے اور بولے "سنا ہے آپ جیل میں شاعری کرتے ہیں ہم آپ کو شاعری نہیں کرنے دیں گے" میں نے کہا "مت کرنے دو مگر میں تو بڑی سادہ چیزیں کہتا ہوں، سادہ سادہ الفاظ میں" آپ کا جو یہ سپاہی ہے، رات کو اس کے کان میں شعر سناؤں گا۔ یہ صبح جا کر چوراہے پر سنائے گا اور پھر شعر پورے میانوالی اور پھر ملک میں پھیل جائے گا۔"

میانوالی جیل میں ہم اس کمرے میں بھی رہے، جہاں پنڈت جواہر لعل نہرو، مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو بھی رہے تھے۔ اس کمرے میں ایک غسل خانہ اور ساتھ جنگلہ اور برآمدہ بھی تھا۔ وہاں ہم پانچ آدمی تھے۔ راؤ رشید، امین مغل اور جہانگیر بدر کو ہم نے کمرے میں ڈال دیا اور میں اور اصغر خادم ایڈووکیٹ برآمدے میں پڑ گئے۔ میں، راؤ رشید اور چودھری اصغر خادم تاش کھیلا کرتے تھے، ہم کھیل رہے تھے کہ اسسٹنٹ جیلر آیا اس نے سلام کیا جہانگیر بدر بولا "بھئی صرف سلام کرو گے یا کوئی کام کی بات بھی کرو گے۔ رہائی وغیرہ کے بارے میں کوئی خبر ہے؟" اس نے

کہا کہ ’’حبیب جالب اور راؤ رشید کی رہائی کا حکم آیا ہے‘‘ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا ’’وہ مشروط ہے یا غیر مشروط کیونکہ اگر مشروط ہے تو واپس چلے جاؤ کہ اس وقت پتے اچھے آئے ہیں۔‘‘

بہت سے لوگ ضیاء الحق سے معافی مانگ کر رہا ہوئے تھے بعد میں وہ ایم این اے، ایم پی اے ہو گئے، ان میں پیپلز پارٹی کے بہت سے لوگ بھی شامل تھے، مجھے نہ تو ایم این اے ہونا تھا نہ ایم پی اے، ہمارا تو اصولی معاملہ تھا تو ہم جیل آ گئے، پھر معافی کا کیا مطلب؟ اور آخرِ کار خود ہی حکمرانوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔‘‘

خواتین کا جلوس

12 رفروری 1983 کا دن ''حیاتِ جالب'' میں ایک انوکھے باب کا اضافہ کر گیا۔ خواتین نے آدھی گواہی کے خلاف ایک احتجاجی جلوس نکالا تھا۔ اس جلوس کو لاہور ہائی کورٹ میں جا کر چیف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کو ایک یادداشت پیش کرنا تھی۔ خواتین کا یہ جلوس ہال روڈ ریگل چوک (38) (سینئر ترین پریس فوٹوگرافر جناب ایف، ای چوہدری نے اپنے انٹرویو مطبوعہ سنڈے میگزین روزنامہ ایکسپریس مورخہ 19 راپریل 2006 میں حبیب جالب چوک کہا ہے) سے شروع ہونا تھا اور تقریباً ڈیڑھ دو فرلانگ چل کر اسے ہائی کورٹ پہنچنا تھا۔ مگر جابر حکمران کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔ لاہور ہائی کورٹ میں عابد حسن منٹو، اعتزاز احسن، سید افضل حیدر اور حبیب جالب موجود تھے، جنہوں نے خواتین کے جلوس کو لاہور ہائی کورٹ میں خوش آمدید کہنا تھا۔ مگر پولیس کی بھاری نفری نے اعلیٰ افسران کے ساتھ جلوس کو چلنے ہی نہیں دیا اور وہیں روک لیا۔ اس جلوس کی قائد عاصمہ جہانگیر تھیں۔ جلوس روکنے پر خواتین نے وہیں دھرنا دے دیا اور اپنے حقوق کے لیے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ عاصمہ جہانگیر نے حالات دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا اور وہ لاہور ہائی کورٹ پہنچ گئیں اور عابد حسن منٹو، افضل حیدر، اعتزاز احسن اور جالب سے اپنا عندیہ بیان کرتے ہوئے کہا ''پولیس آگے نہیں بڑھنے دے رہی، اس صورتِ حال میں بہتر ہوگا کہ حبیب جالب ہمارے ساتھ چلیں اور اپنی کچھ نظمیں سنائیں اور پھر خواتین وہیں سے پرامن طور پر منتشر ہو جائیں گی'' آگے کی روداد خود حبیب جالب سے سنیے۔

(39) ''میں ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا اب کار اسٹارٹ ہوئی تو ایک لہر میرے

ذہن میں آئی کہ یہ جلوس اگر نہ نکلا تو احتجاج رک جائے گا، میں نے سوچا کہ اب میں جلسے جلوسوں کو منتشر کرنے کے لیے ہی رہ گیا ہوں؟ میرا کام تو جلوس کو اور Movement کو جاری رکھنے کا ہے۔ یہی میرا فریضہ ہے کہ احتجاج جاری رہے۔ میں وہاں پہنچا تو خواتین دھرنا دیے بیٹھی تھیں۔ میں نے وہاں ایک مختصر تقریر کی۔ اس کے بعد خواتین کے بارے میں کچھ نظمیں سنانا شروع کیں تو خواتین کے چہروں پر ایک چمک سی آ گئی، ایک حوصلہ ان کے چہروں سے جھلکنے لگا اور میرا کلام سنانے کا مقصد بھی ان کے حوصلے بڑھانا ہی تھا۔ اس دوران ایک ''ایس ایچ او'' آیا اور مجھ سے بولا'' جالب صاحب ادھر آیے میری بات سنیئے'' خواتین نے بیک زبان ہو کر کہا ''اس کی بات مت سنیئے'' میں نے کہا چلو سن لیتے ہیں اس نے مجھ سے کہا ''ان خواتین کو وین میں بٹھا کر ہائی کورٹ لے چلتے ہیں'' پولیس افسر کی بات سن کر میں نے اس سے کہا '' آخر پولیس والے ہی نکلے نا! میں جانتا ہوں تم ان کو بٹھا کر سول لائنز تھانے لے جاؤ گے، اور اب ہٹ جاؤ'' میں پھر خواتین کے دائرے میں آ گیا، میں نے پھر نظمیں سنانا شروع کر دیں اور پھر خواتین جوش و جذبے کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ اس موقع پر میں نے پولیس والوں کو کہا ''ہٹو پولیس والو'' اور خواتین سے کہا ''چلو بیبیو!'' میں نے ان کا رخ مال روڈ کی طرف کر دیا اور خواتین ہائی کورٹ کی طرف چلنے لگیں کہ پولیس نے پھر انہیں روک لیا اور زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ میں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو وہاں کھڑے ایک ڈی ایس پی سے کہا ''یہ کیا ہو رہا ہے'' ہٹاؤ ان پولیس والوں کو'' میرا یہ کہنا تھا کہ اس نے ایک انسپکٹر کو اشارہ کیا اور کہا '' پکڑ لو اس حبیب جالب کو'' اس انسپکٹر نے مجھے پکڑ لیا، اس کے ساتھ پندرہ بیس پولیس والے بھی تھے، اور انہوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ وہ بوٹوں سے پنڈلیوں پر ضربات لگا رہے تھے اور ڈنڈے میری پیٹھ پر برسا رہے

تھے۔ میرا گریبان اس انسپکٹر نے پکڑ رکھا تھا، سردیوں کے دن تھے میری واسکٹ کے اوپر والے بٹن بند تھے اور میرا گلا اس کی مضبوط گرفت میں تھا، میری آنکھیں باہر آ رہی تھیں اور اندھیرا میری آنکھوں کے سامنے چھا رہا تھا۔ میری حالت خراب ہو رہی تھی، وسیم چوہدری جو ہائی کورٹ بار کے جنرل سیکرٹری تھے۔ انہوں نے مجھے اس حال میں دیکھا اور آگے بڑھ کر انسپکٹر کی گرفت سے مجھے چھڑایا، میں نے اس کو اشارے سے کہا کہ میری واسکٹ کے بٹن توڑ دو اس نے واسکٹ کھول دی اور میرا سانس بحال ہوا، وسیم چوہدری نے اس پولیس انسپکٹر کو موٹی سی گالی دی اور پولیس والوں نے وسیم چوہدری کو پکڑ لیا اور اس کے ساتھ دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔

جب پولیس نے مجھے چھوڑا تو ''ڈان'' کے بیورو چیف نثار عثمانی وہاں موجود تھے، انہوں نے مجھے سنبھالا اور سہارا دے کر پریس کلب لاہور لے گئے جہاں انہوں نے مجھے پانی پلایا۔ اس دن خواتین کے جلوس میں بڑے بڑے لوگوں کی مائیں، بہنیں تھیں، اعتزاز احسن کی والدہ محترمہ تھیں ان کی بیگم بشریٰ اعتزاز تھیں، ایس ایم ظفر کی بیوی تھیں، مزدوروں کی خواتین تھیں، محنت کشوں کی عورتیں تھیں، سیاسی ورکر شاہدہ جبیں، ساجدہ میر، عابد حسن منٹو کی بیگم تھیں اور بھی بہت خواتین تھیں۔ اس دن جلوس کی رپورٹنگ کے لیے بی بی سی کی کچھ صحافی خواتین بھی آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے یہ سب منظر دیکھا۔ جس پر میں نے یہ شعر کہے تھے۔

بڑے بنے تھے جالب صاحب پٹے سڑک کے بیچ
گالی کھائی، لاٹھی کھائی، گرے سڑک کے بیچ
کبھی گریباں چاک ہوا اور کبھی ہوا دل خون
ہمیں تو یونہی ملے، سخن کے صلے سڑک کے بیچ
جسم پہ جو زخموں کے نشاں ہیں، اپنے تمغے ہیں
ملی ہے ایسی داد وفا کی، کسے سڑک کے بیچ''

جنرل ضیاء کا دور جاری تھا اور جالب کی جدوجہد بھی جاری تھی اور وہ جبر و استبداد کے خلاف مسلسل آواز اٹھاتے رہے۔ 19/دسمبر 1984 کو جنرل کی حکومت نے ''ریفرنڈم'' کا ڈھونگ رچایا اور اس روز دنیا بھر میں ''اک شخص'' نے پوری قوم کو شرمندہ و رسوا کیا۔ پوری قوم مذاق بن کر رہ گئی۔ ''ریفرنڈم'' پر لوگ گھروں سے نکلے ہی نہیں، ملک کے تمام شہروں، قصبوں، گاؤں، دیہاتوں میں سناٹا تھا۔ جالب نے اس ریفرنڈم کی تصویر کشی یوں کی۔

''ریفرنڈم''

شہر میں ہُو کا عالم تھا
جن تھا یا ریفرنڈم تھا
قید تھے دیواروں میں لوگ
باہر شور، بہت کم تھا
کچھ باریش سے چہرے تھے
اور ایمان کا ماتم تھا
مرحومین شریک ہوئے
سچائی کا چہلم تھا
دن انیس دسمبر کا
بے معنی، بے ہنگم تھا
یا وعدہ تھا حاکم کا
یا اخباری کالم تھا

ضیاء دور میں ایک بار جالب ''بہ رنگ غالب'' جوا کھیلتے ہوئے بھی گرفتار ہوئے اور پولیس نے داؤ پر لگی ہوئی رقم تین چار سو روپے، تاش کے پتے اور رات کے وقت سڑک کی فٹ پاتھ پر جواء کھیلنے کے لیے روشنی کی غرض سے استعمال ہونے والی بجلی کی تار (حالانکہ وہ سردی کا موسم تھا) بھی قبضہ میں لے لی۔ اسی دور میں ایک بار ''حدود'' کی زد میں بھی جالب صاحب آئے اور انہیں،

شراب نوشی کے الزام میں پکڑا گیا۔ میاں محمود علی قصوری، حیات تھے انہوں نے گورنر پنجاب جنرل سوار خان کو فون کیا کہ ''فوج کی آدھی چھاؤنی شراب پیتی ہے'' اگر یہ سچ ہے تو میں جالب کا کیس عدالت میں لے جا رہا ہوں'' جنرل سوار خان نے معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا ''ہم نے جالب صاحب کو گرفتار نہیں کیا، پتہ نہیں کس بیوقوف نے یہ حرکت کی ہے'' اور پھر جالب صاحب کو چھوڑ دیا گیا مگر آل انڈیا ریڈیو نے تو یہ خبر نشر کر دی ''معروف شاعر حبیب جالب حدود آرڈیننس کے تحت گرفتار۔ ان پر حد نافذ کرتے ہوئے کوڑے مارے گئے'' ہندوستان ہی کے کسی شاعر نے اس واقعہ پر کہا تھا۔

گھر سے پی کر شراب نکلا تھا
یہ خطا تھی حبیب جالب کی
وطنِ پاک میں بھی یہ ناداں
نقل کرتا ہے مرزا غالب کی

جنرل ضیاء ہی کے دور میں ایک بار جالب صاحب کو اور عوامی نیشنل پارٹی کے جنرل سیکرٹری قسور گردیزی صاحب کو نو محرم کی رات یہ کہہ کر گرفتار کیا گیا کہ ''کل دسویں محرم کے جلوس میں آپ نے ذوالجناح پر پتھراؤ کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔'' جبکہ قسور گردیزی خود اثنا عشری تھے۔

والدہ صاحبہ کا انتقال

31 ر اکتوبر 1986 کو ہماری والدہ صاحبہ کا صبح ساڑھے سات بجے میرے گھر پر انتقال ہوا۔ جالب صاحب والدہ کے انتقال پر لاہور سے اسی روز کراچی آئے۔ اس دن کراچی میں شدید ہنگامے ہو رہے تھے۔ ایم کیو ایم کا جلوس (جو کراچی سے حیدر آباد جا رہا تھا) سہراب گوٹھ پہنچا تو شدید فائرنگ ہوئی، شہر میں جگہ جگہ سڑکوں پر آگ لگی ہوئی تھی اور ہم نے جالب بھائی کے ساتھ انہی حالات میں بعد از نمازِ مغرب والدہ صاحبہ کو سخی حسن قبرستان میں سپردِ خاک کیا۔ مجھے یاد آ رہا ہے لحد میں اتارنے سے پہلے جالب بھائی نے والدہ صاحبہ کا آخری دیدار کرتے ہوئے اپنا سر جنازے سے ٹیک کر عظیم ماں کو سجدہ ء آخر کیا تھا۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔

جالب صاحب اب اکثر بیمار رہنے لگے تھے اور لاہور، کراچی کے ہسپتالوں میں اکثر جانا آنا شروع ہو گیا تھا۔ انہی دنوں لاہور کے شیخ زید ہسپتال میں جالب صاحب داخل تھے، گورنر پنجاب جنرل جیلانی جالب صاحب کی عیادت کو آئے اور ان سے کہا کہ "حکومت کے خرچ پر آپ بیرون ملک علاج کے لیے چلے جائیں" جالب صاحب نے جواب دیا "یہاں لوگوں کو ڈسپرین نہیں ملتی، میں بیرون ملک علاج کے لیے کیسے چلا جاؤں۔"

اسی دور میں ایک بار مرکزی وزیر داخلہ چوہدری شجاعت حسین پانچ لاکھ روپے لیکر جالب صاحب کے گھر آئے، چوہدری ظہور الٰہی جالب صاحب کے بڑے دوست اور قدر دان تھے اس حوالے سے ظہور الٰہی کے بیٹے شجاعت حسین بھی جالب صاحب کے قریب تھے۔ چوہدری شجاعت نے جالب صاحب سے کہا "آپ بیمار ہیں تو میں یہ پیسے لایا ہوں اور آپ کی نذر کرنا

چاہتا ہوں'' جالب صاحب نے جواب دیا ''تم ظہور الٰہی کے بیٹے ہو، یوں میرے بھتیجے ہو، تم اپنی جیب سے پچاس روپے میرے تکیے کے نیچے رکھ جاؤ، مگر حکومت کے پانچ لاکھ میں نہیں لوں گا'' اور جالب صاحب نے نہیں لیے۔

1988 میں بے نظیر بھٹو جب وزیر اعظم بنیں تو نیشنل بک فاؤنڈیشن کی ڈائریکٹر فہمیدہ ریاض نے تمام صوبوں سے ادیبوں، شاعروں کا انتخاب کیا اور پنجاب سے حبیب جالب کو منتخب کیا گیا اور انہیں ایک لاکھ روپے اور گولڈ میڈل بطور ''جمہوریت ایوارڈ'' دینے کا اعلان کیا گیا۔ یہ ایوارڈ اور رقم لینے سے پہلے جالب صاحب نے فہمیدہ ریاض کا خط اپنے احباب کو دکھایا، عابد حسن منٹو، آئی، اے رحمان، نثار عثمانی اور اختر قزلباش سے اس بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ''یہ انعام آپ کو آپ کی تمام تر شاعری کے اعتراف کے طور پر دیا جا رہا ہے جس میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف بھی آپ کی نظمیں موجود ہیں۔ جالب صاحب نے ان احباب کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے ایک منتخب جمہوری وزیر اعظم سے یہ رقم اور ''جمہوریت ایوارڈ'' وصول کیا۔

حبیب جالب کے ایک لاکھ روپے اور جمہوریت ایوارڈ وصول کرنے کی خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے چوہدری شجاعت حسین کا یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا کہ ''حیرت ہے، میں پانچ لاکھ روپے لیکر گیا تھا، مگر جالب نے وہ ٹھکرا دیے اور بے نظیر سے ایک لاکھ روپے لے لیے'' چوہدری صاحب نے مزید یہ بھی کہا کہ ''مگر کہے گا، جالب اپنی مرضی سے ہی'' بہر حال چوہدری شجاعت صاحب کو ایک فوجی آمر اور منتخب وزیر اعظم کے فرق کو ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے تھا۔ اور وہ جو انہوں نے کہا تھا کہ جالب کہے گا اپنی مرضی سے ہی تو ایسا ہی ہوا اور جالب صاحب نے ایک سال گزرنے پر بے نظیر دور کی یوں تصویر کشی کی ۔

وہی حالات ہیں فقیروں کے
دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے
وہی اہلِ وفا کی صورتِ حال
وارے نیارے ہیں بے ضمیروں کے

سازشیں ہیں وہی خلاف عوام
مشورے ہیں وہی، مشیروں کے
ہر بلاول ہے، دیس کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے
اپنا حلقہ ہے، حلقہء زنجیر
اور حلقے ہیں سب امیروں کے
بیڑیاں سامراج کی ہیں وہی
وہی دن رات ہیں اسیروں کے

وزیر اعظم بے نظیر بھٹو، جالب صاحب کا بڑا احترام کرتی تھیں اپنے دورِ حکومت میں انہوں نے جالب کی شاعری کا کبھی بُرا نہ منایا۔ ایک بار وہ جالب صاحب سے ملنے ان کے گھر بھی آئیں۔ ابھی انہوں نے نیا نیا حلف اٹھایا تھا۔ اپنے ساتھ آنے والے وزرا اور پارٹی رہنماؤں کے سامنے بے نظیر بھٹو نے جالب صاحب سے پوچھا "میں کیسے حکومت چلاؤں، آپ مجھے مشورہ دیں" پہلے تو جالب صاحب ٹالتے رہے، بالآخر بڑا مجبور کرنے پر وہ بولے "بی بی لوگ آپ سے پیار کرتے ہیں تو آپ بھی لوگوں کے مسائل سے پیار کریں، آپ واشنگٹن کی طرف دھیان نہ دیا کریں، وہاں سے تو جنگ آتی ہے، بھوک آتی ہے اور مارشل لاء آتے ہیں"

ایک بار اسی دور میں سندھ کے دانشور جام ساقی لاہور تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں فلیٹیز ہوٹل میں عصرانہ دیا گیا۔ درویش صفت رہنما معراج خالد صدارت کر رہے تھے۔ جالب نے وہاں فی البدیہہ کہی گئی ایک پنجابی نظم سنائی۔

کڑیے

نہ جا امریکہ نال کڑے
اے گل نہ دیویں ٹال کڑے

اینے قتل آزادیاں دا کیتا
اینے ایس دھرتی دا لہو پیتا

اپنے کٹوایا بنگال کڑے
نہ جا امریکہ نال کڑے
سانوں رُوس دے نال لڑوندا اے
ایویں لوکاں نوں مرواندا اے
مینوں تیرا بڑا خیال کڑے
نہ جا امریکہ نال کڑے

گل ٹھیک ای کہندا ساقی وی
کتے چلا نہ جائے باقی وی
کر راکھی ملک سنبھال کڑے
نہ جا امریکہ نال کڑے

یہ نظم سن کر پیپلز پارٹی کے جیالے کھڑے ہوگئے اور جالب کے خلاف نعرے بازی شروع کردی۔ اس پر امریکہ مخالف لوگوں نے مقابلے پر نعرے لگانے شروع کردیئے ''امریکہ کا جو یار ہے غدار ہے غدار ہے'' اور پھر ''جیالے'' جلسہ گاہ سے چلے گئے۔ حالانکہ صدرِ جلسہ ملک معراج خالد انہیں بلاتے رہے روکتے رہے۔ یہ بات بے نظیر بھٹو صاحبہ تک پہنچی اور یوں پہنچائی گئی کہ ''جالب نے آپ کی تضحیک کی ہے، آپ کو ''کڑے'' کہا ہے'' بے نظیر بھٹو نے جیالوں کی بات پر یقین نہیں کیا اور الطاف احمد قریشی سے ''کڑے'' کا مطلب پوچھا تو انہیں بتایا گیا کہ ''کڑے'' پیار میں بیٹی کو کہا جاتا ہے۔ تب بے نظیر بھٹو صاحبہ نے جالب صاحب سے خود فون پر بات کی اور جیالوں کی ان کے خلاف نعرے بازی پر معذرت چاہی اور ان کی نظم کو جرأت و سچائی سے تعبیر کیا۔

یہی جالب تھے کہ جب بے نظیر بھٹو طویل جلاوطنی کے بعد وطن تشریف لائی تھیں تو انہوں نے ''دہشتی لڑکی'' کے نام سے بے نظیر کے لیے ایک نظم لکھی تھی یہ جنرل ضیاء الحق کا خوفناک دور تھا اور جنرل تمام تر جاہ و جلال کے ساتھ تخت پر موجود تھا۔ مگر جالب کو بھی حاکم وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے ہی میں مزہ آتا تھا۔ جالب نے کہا ۔

نہتی لڑکی

ڈرتے ہیں بندوقوں والے، ایک نہتی لڑکی سے
پھیلے ہیں، ہمت کے اجالے، ایک نہتی لڑکی سے

ڈرے ہوئے ہیں مرے ہوئے ہیں لرزیدہ لرزیدہ ہیں
ملاّ، تاجر، جنرل جیالے، ایک نہتی لڑکی سے

آزادی کی بات نہ کر لوگوں سے نہ مل، یہ کہتے ہیں
بے حس، ظالم، دل کے کالے، ایک نہتی لڑکی سے

دیکھ کے اس صورت کو جالب، ساری دنیا ہنستی ہے
بلوانوں کے پڑے ہیں پالے، ایک نہتی لڑکی سے

بے نظیر بھٹو کے دور میں بھی جالب اکثر ہسپتالوں میں رہے، وہ سروسز ہسپتال لاہور میں تھے کہ جب وزیراعظم بے نظیر بھٹو ان کی عیادت کے لیے ہسپتال آئیں، بے نظیر صاحبہ نے دوپٹہ سر پر لے رکھا تھا اور ہاتھ میں تسبیح تھی، اس صورتِ حال میں وزیراعظم صاحبہ کو دیکھ کر جالب صاحب پہلے تو کچھ دیر خاموش رہے، بے نظیر بھٹو صاحبہ کہہ رہی تھیں "جالب صاحب آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے آپ فکر نہ کریں ہم آپ کو حکومت کے خرچ پر بیرون ملک علاج کے لیے بھیجیں گے، آپ قوم کا سرمایہ ہیں" اور دوسری طرف جالب ایک عجب اضطرابی صورتِ حال سے دوچار تھے اور بالآخر وہ بولے "بی بی ڈاکٹروں نے مجھے بتایا ہے کہ میری طبیعت خاصی خراب ہے، مگر آپ کو اس حال میں دیکھ کر کہ آپ نے کس کے سر پر دوپٹہ باندھ رکھا ہے اور تسبیح ہاتھ میں ہے تو مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے میرا آخری وقت قریب آ گیا ہے" اور پھر جالب صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں بی بی سے کہا "یہ دوپٹہ کھولو بیٹی مجھے تمہارے سر کے بال نظر آئیں اور یہ تسبیح بھی ہٹاؤ اسے اپنے پرس میں رکھو" اور بے نظیر بھٹو صاحبہ جالب صاحب کی باتوں پر ہنس رہی تھیں، دوپٹہ سر سے کھول رہی تھیں اور انہوں نے تسبیح بھی پرس میں رکھ لی تھی اور پھر جالب بولے "ہاں بیٹی اب مجھے اچھا لگ رہا ہے"

بے نظیر بھٹو صاحبہ نے اپنی بات دہراتے ہوئے پھر جالب صاحب سے کہا ''اچھا تو آپ تیار رہیں ہم آپ کو علاج کے لیے سرکاری خرچ پر باہر بھجوار ہے ہیں'' اور جالب نے وہی جواب بے نظیر کو بھی دیا ''یہاں لوگوں کو ڈسپرین نہیں ملتی، میں کیسے علاج کے لیے باہر چلا جاؤں''

حرفِ سردار

جالب کے شب و روز اکثر ہسپتالوں ہی میں گزر رہے تھے، کبھی کراچی میں، ڈاکٹر ادیب رضوی کے ساتھ سول ہسپتال میں کبھی میڈ کیئر ہسپتال میں ڈاکٹر طارق سہیل تو کبھی انکلسریا میں ڈاکٹر بدر صدیقی یا پھر لاہور میں شیخ زید ہسپتال، سروسز ہسپتال، میو ہسپتال، گنگا رام ہسپتال، ان کی صحت دن بدن گرتی جارہی تھی مگر انہوں نے اس حالت میں بھی اپنا کام جاری رکھا، مشن جاری رکھا۔ 25 سال بعد ان کا پاسپورٹ بحال ہوا۔ 1964 میں ان کا پاسپورٹ جنرل ایوب کے زمانے میں ضبط کیا گیا تھا اور آخری بار وہ 1961 میں بمبئی، دہلی وغیرہ مشاعرے پڑھنے گئے تھے اور یوں 1986 میں جالب 25 سال بعد ملک سے باہر لندن گئے۔ جہاں ان کی کتاب ''حرفِ سردار'' کو افتخار عارف ترتیب دے رہے تھے۔ جامع سائز میں محدود نسخے عام کتابی سائز اور عوامی ایڈیشن تین اقسام میں اسے شائع کیا گیا تھا اور اس اہتمام کے ساتھ اردو کے دو شعرا کا ہی کلام اردو مرکز لندن سے شائع کیا گیا تھا۔ فیض احمد فیض اور حبیب جالب۔

جالب صاحب ''حرفِ سردار'' میں لکھتے ہیں ''برگِ آوارہ'' دھیمے لہجے کی شاعری ہے جس میں چھوڑے ہوئے دیاروں، بچھڑے ہوئے یاروں کی یادیں بکھری پڑی ہیں جگہ جگہ عدم تحفظ کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے بعد میں آنے والی کتابوں میں دھیما لہجہ بلند آہنگ ہو گیا ہے۔ کیوں نہ ہوتا کہ ایک منظم منصوبے کے تحت وطنِ عزیز کو خوفناک آمریت کے شکنجے میں جکڑا جارہا تھا۔ جتنا حبس بڑھتا گیا لہجہ اتنا ہی تند و تیز ہوتا گیا اسی لہجے کی وجہ سے میں کئی بار پسِ دیوارِ زنداں گیا اور زنداں سے ایک شعری مجموعہ لے آیا۔

ایک مدت سے جی چاہتا ہے کہ تفصیل سے ان شعراء کے بارے میں لکھا جائے جو ازل سے

رجعت پسند، عوام دشمن برسراقتدار طبقے سے نبردآزما رہے ہیں۔ مثلاً قراۃ العین طاہرہ، منصور حلاج، ابوالقاسم لاہوتی، ایران میں قاچاری اور پہلوی دور کے شعراء کہ جن کے جسم میں جلتی موم بتیاں گاڑھی گئیں۔ زندانوں میں ڈالے گئے اور وہ شعر پڑھتے رہے۔

یک دست جامِ بادہ و یک دست زلفِ یار
رقصِ چنیں میانہ میدانم آرزو است
اے خوش آں عاشق سرمست کہ درپائے حبیب
سرو دستار نداند کہ کدام اندازد!

سچ تو یہ ہے کہ میں ان کے ہی سلسلے کا شاعر ہوں، مولانا حسرت موہانی اور مخدوم محی الدین کا بھی پیروکار ہوں۔ بچپن سے بزرگوں سے سنتا چلا آیا ہوں کہ ''اے خدا ایمان کے ساتھ قبر میں اتار'' اس دعا کا مطلب اب سمجھ میں آیا کہ مرتے دم تک لوگوں سے پیمانِ وفا باندھے رکھنے والے شاعر کو ہی عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ حبیب جالب۔''

حرفِ سردار کے ''انتساب'' کو جالب نے اپنی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا ہے۔

دار پہ بھی سچ کہنے والے انسانوں کے نام
طالب علموں، محنت کاروں، دہقانوں کے نام
دنیا بھر کے اپنے جیسے دیوانوں کے نام

یہیں اسی جگہ اس لمحے حبیب جالب کی وہ غزل نقل کرنا چاہوں گا۔ اسے بھی حبیب جالب نے اپنی ہینڈ رائیٹنگ میں لکھا اور اختتام پر دستخط کے ساتھ تاریخ بھی درج ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

اور سب بھول گئے، حرفِ صداقت لکھنا
رہ گیا کام ہمارا ہی بغاوت لکھنا
لاکھ کہتے رہیں ظلمت کو نہ ظلمت لکھنا
ہم نے سیکھا نہیں پیارے بہ اجازت لکھنا
نہ صلے کی، نہ ستائش کی تمنا ہم کو
حق میں لوگوں کے ہماری تو ہے عادت لکھنا

ہم نے جو بھول کے بھی شہ کا قصیدہ نہ لکھا
شاید آیا اسی خوبی کی بدولت لکھنا
اس سے بڑھ کر مری تحسین بھلا کیا ہوگی
پڑھ کے ناخوش ہیں، مرا صاحب ثروت لکھنا
دہر کے غم سے ہوا ربط تو ہم بھول گئے
سرو قامت کو، جوانی کو قیامت لکھنا
کچھ بھی کہتے ہیں کہیں شہ کے مصاحب جالب
رنگ رکھنا یہی اپنا اسی صورت لکھنا

حبیب جالب لندن 10/ جون 1986

بظاہر تو عدالت کے ذریعے جالب صاحب کا پاسپورٹ بحال ہوگیا تھا مگر جب تک جنرل ضیاء کا دور رہا جالب صاحب پر بیرون ملک جانے پر بندشیں قائم رہیں کبھی دبئی جاتے ہوئے کراچی ائیرپورٹ پر روک لیا۔ ہندوستان تو سرے سے جانے ہی نہیں دیا۔ دہلی (ہندوستان) کے معروف مشاعرہ آرگنائزر علی صدیقی، جنرل ضیاء سے ذاتی ملاقات میں درخواست کرتے رہے کہ حبیب جالب کو ہندوستان جانے کی اجازت دیں، مگر جنرل ضیاء کا جواب تھا ''سارے پاکستان کے شاعر لے جاؤ حبیب جالب کو نہیں جانے دوں گا۔''

یوں پاسپورٹ تمام تر بندشوں کے بعد صحیح معنی میں 1988 میں بے نظیر بھٹو کی حکومت میں اس وقت کے وزیر داخلہ چودھری اعتزاز احسن نے بحال کیا اور پھر حبیب جالب نے آزادانہ بیرون ملک سفر کیے۔ یورپ کے ممالک میں گئے کینیڈا، امریکہ اور روس بھی گئے۔ ان تمام ممالک میں جالب صاحب کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ ان کی کتابوں کے ایڈیشن شائع کیے گئے۔ مشاعرے ہوئے جہاں اکیلے جالب ہی کلام سناتے۔ کینیڈا کے ضیاء علیگ کے مضمون کا ایک فقرہ ضرور لکھنا چاہوں گا (40) یہ باہر سے آیا ہوا پہلا شاعر تھا جو صرف اپنے اعتقادات میں گم، اپنے convictions سے لپٹا ہوا، اپنی شاعری میں گم، جسے یہ بھی خواہش نہ تھی کہ ''نیاگرا فالز'' ہی دیکھ لے'' اس فقرے کو میں بلا تبصرہ یونہی چھوڑ رہا ہوں تاکہ پڑھنے والے خود ہی غور کریں۔ اب

کچھ روس جانے کا احوال جالب کی زبانی سن لیتے ہیں:

(41) ''روس میں رائیٹرز ایسوسی ایشن نے ہمیں روس کا دورہ کرنے کا دعوت نامہ بھیجا میں ان دنوں میو ہسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ سردی بے پناہ تھی، میری طبعیت بھی ٹھیک نہیں تھی، میں نے سوچا پھر وہاں جانے کا موقع شاید نہ ملے، اس لیے یہ موقع کھونا نہیں چاہیے۔

(42) ہم روس پہنچے، ماسکو میں رائیٹرز کا ایک وفد ہمیں لینے کے لیے آیا ہوا تھا، انہوں نے ہمیں لینن گراڈ کے ایک بڑے ہوٹل میں ٹھہرایا۔ ہماری مترجمہ ایک بہت اچھی پیاری اور کلچرڈ خاتون تھیں، اسے اس بات کا ادراک تھا کہ یہ آدمی بیمار ہے۔ وہ ہر روز میری پوچھ گچھ کرتی اور بار بار پوچھتی ''ڈاکٹر کی ضرورت تو نہیں ہے؟'' پھر ہم دوشنبے گئے، جہاں مولانا عبدالرحمٰن جامی کی 575ویں سالگرہ کا جشن تھا۔ مولانا جامی فارسی میں حافظ کے بعد بہت بڑے شاعر تھے انہیں ''خاتم الشعراء'' کا لقب ملا تھا۔ روس میں جہاں جہاں فارسی سمجھی جاتی ہے، وہاں وہاں وہ بہت پاپولر ہیں۔ دوشنبے میں ان کا بت بھی نصب کیا گیا ہے۔ میں اس تقریب میں موجود تھا۔ سمرقند بھی جانا ہوا، امام بخاریؒ کے مزار پر بھی حاضری دی۔ ان کے مقبرے میں قرآن مجید کے پرانے پرانے نسخے رکھے ہوئے تھے۔ سمرقند میں ہی امیر تیمور لنگ کے مزار پر بھی گئے۔ وہاں کے مدرسے بھی دیکھے، ان کی اونچی اونچی دیواروں پر نقاشی اور سونے کا کام دیکھ کر امیر تیمور لنگ کے ذوق کا اندازہ ہوتا تھا، وہ عجائبات تھے۔ ان مدرسوں میں مولانا جامی بھی پڑھتے رہے۔ امیر تیمور آدھی دنیا فتح کر چکا تھا۔ وہ جب کسی جگہ کو فتح کر کے آتا تو اس کی یاد میں ایک مدرسہ بنواتا تھا۔ وہ دنیا کو فتح کرنے کے ساتھ ساتھ علم کو بھی فتح کرتا جاتا تھا۔ ماسکو کے رائیٹرز سے ملاقاتیں ہوئیں۔ تقریبات ہوئیں، رائیٹرز کو دیکھا تو یوں لگا کہ وہ ہمارے یہاں

کے ''سمگلوں'' اور ''ولیکاؤں'' جیسے لوگ ہیں۔ ان کی زندگی اور کھانے پینے سے یہی جھلکتا تھا۔ ان کے رائیٹرز کو بھی وہ تمام سہولتیں اور آسائشیں حاصل ہیں جو متمول لوگوں کو دستیاب ہیں۔ ہم اپنے آپ کو دیکھ کر شرمندہ ہی ہو رہے تھے۔

ماسکو میں عبدالرحمٰن جامی کے جشنِ ولادت کے سلسلے کی آخری تقریب تھی، میں نے وہاں مولانا جامی پر نظم پڑھی، جو میں نے وہیں لکھی تھی۔ اس نظم کا روسی ترجمہ وہاں کی معروف ادیبہ ''نومیلا'' نے کیا جنہیں اردو زبان پر مکمل عبور حاصل ہے۔ نظم ملاحظہ ہو۔''

نذرِ جامی

جامی کو اک لگاؤ تھا خلقِ خدا کے ساتھ
اس واسطے چلا نہ کبھی وہ ہوا کے ساتھ
نظم اس کی بے مثال تھی، نثر اس کی لازوال
زندہ ہے فارسی میں وہ اپنی ادا کے ساتھ
خسرو کی طرح وہ بھی بڑا باکمال تھا
دل بستگی اسے بھی تھی ساز و ادا کے ساتھ
وہ دار پر بھی آکے، بدلتا نہیں تھا بات
اس درجہ اس کو عشق تھا عہدِ وفا کے ساتھ
کیا کیا کروں بیاں میں دوشنبے کی خوبیاں
گلشن میں پھر رہا ہوں میں جیسے صبا کے ساتھ
جامی ترے کلام کا چرچا یونہی رہے
جاتے ہیں اپنے دیس کو ہم اس دعا کے ساتھ
شاہوں کے پاس ہوتا ہے، کیا ظلم کے سوا
جالب ہمیشہ لوگ رہے، صوفیا کے ساتھ

جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

جالب بیرون ملک ''جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے'' جب وہ لندن گئے تو ائیر پورٹ پر بیرسٹر صبغت اللہ قادری، شمیم احمد خان (سابق) ڈپٹی اسپیکر پنجاب اسمبلی اور جنرل ایوب کے زمانے میں بننے والے مقدمے میں جالب کے گواہ مسعود بھائی اور منیر ڈار ودیگر لینے آئے۔ قیام بیرسٹر صبغت اللہ قادری کے گھر رہا۔ انہوں نے جالب کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا، ضیاء سرحدی، افتخار عارف، احمد فراز اور جلاوطن سیاسی ورکرز دعوت میں موجود تھے وہیں طے ہوا کہ جالب کے اعزاز میں جلسہ کیا جائے اور جس میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہو، اس جلسہ کی صدارت زہرنگاہ صاحبہ نے کی تھی۔ جلسے میں جنرل ضیاء کے دور کی تمام اپوزیشن موجود تھی جام صادق، غلام مصطفیٰ کھر، سردار عطاء اللہ مینگل، شیخ رشید (بابائے سوشلزم) ہندو، سکھ، عیسائی، مسلمان سب آئے۔ اداکار دلیپ کمار کی بہن بھی شریک تھیں۔ اس جلسے کے حقوق بی بی سی کے چینل فور نے لے لیے تھے۔ ہمراز احسن نے جلسہ کی فلم بندی کی تین گھنٹے کی فلم بنائی، صدر جلسہ زہرہ نگاہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا ''چلیے جالب صاحب نے کسی کی صدارت کو تسلیم تو کیا۔''

اور میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے اس جلسہ میں تمام نشستیں پر تھیں اور لوگ ہال کی سیڑھیوں پر بھی بیٹھے اور سائیڈوں میں کھڑے تھے۔ احمد فراز نے چینل فور پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''ماضی میں کسی شاعر کے لیے اتنے سامعین اکٹھے نہیں ہوئے'' جالب کو لندن آنے کی دعوت ہمایوں گوہر نے دی تھی۔ انہوں نے کراچی میں فیض کی کلیات ''سارے سخن ہمارے'' (مطبوعہ لندن) جالب صاحب کی خدمت میں پیش کی اور کہا کہ ہم آپ کی کلیات بھی اسی طرح

چھاپنا چاہتے ہیں، جالب کی کلیات کا نام ''حرفِ سردار'' تجویز ہوا، اور اس کے مرتب افتخار عارف تھے۔ کلیات کے ٹائیٹل پر جالب صاحب کا اسکیچ بنایا گیا ہے جسے مقصود ثاقب نے ڈیزائن کیا ہے اس کی تقریب رونمائی افرو ایشیا سٹڈی ہال یونیورسٹی آف لندن میں ہوئی تھی۔ صدارت الطاف گوہر نے کی اور انور مقصود نے نظامت کے فرائض انجام دیے تھے۔ انور مقصود کے اسٹیج پر آنے سے پہلے منتظمین نے مرحوم ادیب وشعرا کے لیے ایک منٹ کی خاموشی کروائی۔ اس کے بعد انور مقصود کو کمپیئرنگ کے فرائض سنبھالنے کے لیے اسٹیج پر بلایا گیا انہوں نے آغازِ کلام یوں کیا ''اور سامعین اب دو منٹ کی خاموشی ان ادیبوں شاعروں کے لیے جو زندہ ہیں۔'' یہ جنرل ضیاء کا بدترین آمرانہ دور تھا اور حسب توفیق و روایت ''ماسوائے چند'' سب جنرل ضیاء کے ساتھ تھے۔ خواہ کسی بھی شکل میں۔

لندن سے جالب امریکہ گئے، نیویارک میں روزنامہ نوائے وقت کے عباس اطہر (اب ایڈیٹر روزنامہ ایکسپریس) نے انہیں اپنے ہاں ٹھہرایا، جالب کے اعزاز میں دو تین پروگرام Arrange کیے۔ جالب صاحب کو صبح اٹھ کر walk کرنے کی عادت تھی۔ نیویارک نئی جگہ انہیں راستوں کا علم کہاں تھا سو بیگم عباس اطہر ان کے ساتھ صبح سیر کو جاتیں پھر ان کا لڑکا جانے لگا۔ ایک دن لڑکے نے کہا ''انکل آپ بہت تیز چلتے ہیں، آپ تھکتے نہیں؟'' (عباس اطہر کے بیٹے کا جالب پر یہ خوبصورت زاویے سے تبصرہ ہے) برکلے یونیورسٹی میں بھی جالب کے اعزاز میں تقریب ہوئی، وہاں حقوقِ انسانی کے حوالے سے ایک سرکل تھا، پورا ہال بھرا ہوا تھا، بہت سے امریکن بھی موجود تھے، ایک یہودی لڑکی بھی تھی جو فلسطین کی آزادی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ اس کے لیے جالب نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ دو اڑھائی گھنٹے تک یہ تقریب رہی۔ امریکہ میں مقامی صحافیوں نے جالب سے کہا کہ آپ جو کہیں گے ہم چھاپ دیں گے جالب نے کہا ''آپ کے حکمران ہمارے ملک کے عوام میں بہت غیر مقبول ہیں اور ہمارے عوام آپ کی حکومت سے نفرت کرتے ہیں، کیونکہ آپ کے لوگ آمروں کو سپورٹ کرتے ہیں اور حقوق انسانی پامال کرتے

ہیں۔ آپ کے حکمران اپنے ہاں ''جمہوریت'' رکھتے ہیں اور ہمارے ہاں ''آمریت'' کو فروغ دیتے ہیں۔ آمریت کے دست و بازو بنتے ہیں اور انہیں پالتے ہیں'' جالب مزید کہتے ہیں کہ ''میرے tour اس لحاظ سے مشنری tour تھے کہ میں نے وہاں کھل کر اپنا موقف بیان کیا۔

امریکہ میں جالب کو مولانا ظفر علی خان کے پوتے نے ایک تقریب میں اپنے ہاں مدعو کیا۔ وہاں مولانا ظفر علی خان کی بوڑھی ہمشیرہ بھی موجود تھیں۔ ٹورنٹو (کینیڈا) بھی جالب گئے۔ وہاں بھی حبیب جالب کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ احمد فراز اور سلیم شاہد بھی وہاں مدعو تھے۔ لندن میں قیام کے دوران سارے انگلستان اور سکینڈے نیوین ممالک کو پتہ چل گیا تھا کہ حبیب جالب آئے ہوئے ہیں۔ سعید انجم جو سوشلسٹ پارٹی کے رکن ہیں وہ ناروے میں رہتے ہیں انہوں نے جالب کو اوسلو بلانے کا اہتمام کیا، سعید انجم نے وہاں کے صحافیوں سے بھی جالب کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ'' جالب نے آمرانہ حکومتوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں'' وہاں کے اخبارات نے جالب کے بارے میں تفصیلی رپورٹیں شائع کیں اور وہاں کے ٹی وی پر بھی کوریج ہوئی۔ وہاں انڈیا سے مالک رام اور افسانہ نگار رام لعل بھی آئے ہوئے تھے۔

جالب سویڈن بھی گئے وہاں لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے میاں اکرم کے بھائی رہتے ہیں وہاں بھی مشاعرہ ہوا۔ ایمسٹرڈیم میں اسد مفتی نے حبیب جالب کو خوش آمدید کہا اور وہاں بھی حبیب جالب نے ایک تقریب میں دو گھنٹے تک اپنی شاعری سنائی۔ برمنگھم میں نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما افضل بنگش کی صاحبزادی رہتی ہیں ان کے شوہر ڈاکٹر ہیں انہوں نے جالب صاحب کو وہاں بلایا ان کی کتابوں کی رونمائی کی تقریب کا اہتمام کیا۔ قتیل شفائی کے داماد نے بھی جالب کے اعزاز میں ایک بہت بڑے جلسہ کا اہتمام کیا۔ مانچسٹر میں بھی جالب کے اعزاز میں مشاعرے ہوئے۔ وہاں لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے بیرسٹر ظہور دین بٹ، جن کے والد جمال دین بٹ سہروردی صاحب کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ مانچسٹر میں جالب کے میزبان تھے۔ سردار مظہر علی خان (پیپلز پارٹی والے) لندن میں رہتے ہیں۔ انگلستان میں الیف

ڈی فاروقی ایک معروف آدمی ہیں۔ بریڈفورڈ میں رہتے ہیں اور ایک پرچہ ''اجالا'' کے نام سے نکالتے ہیں۔ انہوں نے بھی لندن میں ہونے والی تقریبات میں بطور منتظم نمایاں کردار ادا کیا۔ لندن میں ''سوہن سنگھ جوش'' ایوارڈ بھی جالب صاحب کو دیا گیا۔ سوہن سنگھ جوش پنجاب کے بہت بڑے کمیونسٹ لیڈر رہتے، شاعر بھی تھے۔ پنجابی ایسوسی ایشن لندن کے سیکرٹری شیر جنگ رام جی اور دیگر ساتھیوں نے جالب کو ایوارڈ کے لیے منتخب کیا۔ ایوارڈ کی تقریب ''ساؤتھ ہال'' میں ہوئی جہاں ایک شیلڈ، لال پٹکا اور پچیس پونڈ (بطور نذرانہ) جالب کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ ایشین کمیونٹی کے جمیل چشتی نے بھی لندن میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جہاں انہیں ''جمہوریت ایوارڈ'' کے نام پر سونے کا تمغہ دیا گیا۔ 1989 میں حبیب جالب 28 سال بعد دہلی گئے۔ جہاں آل ہندو پاک مشاعرے میں انہیں ''حسرت موہانی ایوارڈ'' دیا گیا۔ حبیب جالب آخری بار 1961 میں ہندوستان گئے تھے اور پھر ان کا پاسپورٹ ضبط کر لیا گیا تھا۔

بے نظیر بھٹو کی حکومت (پہلا دور) مقررہ وقت سے پہلے ختم کر دی گئی تھی اور میاں محمد نواز شریف کی حکومت بنا دی گئی۔ یہ حبیب جالب کی زندگی کا آخری دورِ حکومت ثابت ہوا۔ بیماری نے انہیں بری طرح دبوچ رکھا تھا۔ لاہور شہر کے مختلف ہسپتالوں میں علاج جاری تھا۔ شیخ زید ہسپتال میں اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ غلام حیدر وائیں، عیادت کے لیے ہسپتال آئے اور آتے ہی ہاتھ جوڑ کر بولے ''جالب صاحب! ہمارا پیچھا چھوڑو، اور علاج کے لیے بیرون ملک چلے جاؤ سارا خرچہ حکومت برداشت کرے گی اور جالب اپنے جیل کے ساتھی سے کہہ رہے تھے ''کیا جیلیں اس لیے کاٹی تھیں کہ لوگوں کو ڈسپرین نہ ملے اور ہم لاکھوں روپے بیرون ملک اپنے علاج پر خرچ کر دیں۔'' ہر حکمران نے جالب کو بیرون ملک علاج کی پیشکش کی اور ہر حکمران کو جالب نے یہی جواب دیا۔ انتقال سے دو تین ماہ پہلے جالب صاحب جنگ پبلی کیشنز (کہ جہاں ان کی کتابیں بھی چھپیں اور چھپ رہی تھیں) کے تعاون سے کرامویل ہسپتال لندن گئے لیکن انتہائی کمزوری کے باعث وہاں کے ڈاکٹروں نے مزید علاج (Transplant) سے معذوری ظاہر کر دی اور

جالب صاحب تقریباً ایک ماہ لندن رہنے کے بعد واپس شیخ زید ہسپتال لاہور آ گئے۔

1992 میں معروف صحافی نثار عثمانی اور جالب صاحب سروسز ہسپتال لاہور کے ایک بڑے کمرے میں آمنے سامنے بستر ڈالے پڑے تھے۔ یہ ڈاکٹروں کا کمرہ تھا جو انہوں نے ان دونوں کے لیے خالی کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا نثار عثمانی صاحب بستر چھوڑ کر جالب صاحب کے بستر پر آ جاتے اور انہیں تسلی دیتے۔ جالب، عثمانی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیتے اور کہتے ''عثمانی صاحب! میں بستر سے کب اٹھوں گا'' ''یہ آکسیجن کب میرا پیچھا چھوڑے گی'' ''میں ریگل چوک جانا چاہتا ہوں'' اور عثمانی صاحب انہیں تسلی دیتے ہوئے کہتے ''بہت جلد جالب، بہت جلد ہم تم ریگل چوک پر کھڑے ہوں گے، نعرے لگائیں گے'' ان دنوں پورا پنجاب شدید ترین سیلاب کی زد میں تھا۔ گاؤں کے گاؤں سیلاب میں بہہ گئے تھے۔ احمد بشیر ہسپتال تشریف لائے تو کمرے میں داخل ہوتے ہی بولے ''اوئے جالب! اٹھ اوئے تو کہاں بستر پر لیٹا ہے، پنجاب تباہ ہو گیا ہے، گاؤں کے گاؤں صفحہ ہستی سے مٹ گئے ہیں'' مگر بیماری کے ہاتھوں لاچار جالب بستر سے نہ اٹھ سکا۔

اگلے روز ایس ایم ظفر، مہناز رفیع اور جسٹس دراب پٹیل ہسپتال آئے۔ ظفر صاحب جالب بھائی کی ٹانگیں دبانے لگے تو جالب صاحب بولے ''شاہ صاحب رہنے دیں'' مگر ظفر صاحب مصر تھے کہ ''مجھے ٹانگیں دبانے دو'' مگر جالب صاحب نے کچھ دیر بعد ان سے کہا ''بس شاہ جی بس'' اور پھر مجھ سے کہا ''وہ شعر ظفر صاحب کو سناؤ جو میں نے کہے ہیں، دراصل سیلاب زدگان کی حالتِ زار پر اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف کا یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا تھا کہ ''میں اپنی جان دے دوں گا سیلاب زدگان کی حالت پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے'' تو اس بیان پر جالب صاحب نے کہا تھا۔

نہ دل دیدو، نہ جان دیدو، بس اپنی ایک مل دیدو
زیاں جو کر چکے ہو قوم کا تم، اس کا بل دیدو

جالب صاحب نے شیخ زید ہسپتال لاہور میں اپنی شعری زندگی کا اختتام جس طرح کیا میں اس کا عینی شاہد ہوں۔ اس دن میں وہاں موجود تھا۔ رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بج رہے تھے جالب صاحب نہایت کمزوری کے باعث تقریباً غنودگی کے عالم میں رہتے تھے تقریباً ایک ماہ سے اوپر ہو گیا تھا انہوں نے کوئی شعر نہیں کہا تھا کہ اچانک انہوں نے مکمل آنکھیں کھول لیں اور نحیف آواز میں مجھ سے کاغذ اور قلم لینے کو کہا اور پھر اشعار لکھوانا شروع کر دیے یہ نعتیہ اشعار تھے۔

مجھ کم نصیب کو نہ ہوا تیرا در نصیب
چاہیں گے جب حضور تو ہوگا سفر نصیب
میں اُڑ کے چوم آؤں حسیں راستوں کی خاک
ہو جائیں ان کے فضل و کرم سے جو پر نصیب
ان کے کرم کا کیا ہے ٹھکانہ کہ بخش دیں
ہوگی اب ان کے لطف سے وہ رہ گزر نصیب
ہونٹوں پر دوستوں کے رہے، یہ دعا مدام
جاگیں نصیب سے ترے اے چشمِ تر نصیب

کچھ دیر جالب صاحب اشعار کی نوک پلک درست کراتے رہے اور پھر مطمئن ہونے پر مجھ سے کہا "اسے جنگ، دے آؤ" رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں اسی وقت روزنامہ جنگ کے لیے روانہ ہو گیا اور دوسرے روز کے اخبار میں میری بنائی ہوئی خبر کے عین مطابق اشعار شائع ہوئے ان نعتیہ اشعار کے بعد جالب صاحب نے کوئی شعر کوئی مصرعہ نہیں کہا۔

جالب بھائی اچانک خاصے ٹھیک سے نظر آ رہے تھے۔ وہ ٹی وی بھی دیکھتے، ایک آدھ بات بھی کرتے، مجھے کراچی واپس آنا تھا اور میں مطمئن سا کراچی آ گیا۔ میں لاہور ہی میں تھا کہ جب رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ کراچی واپس آیا تو یہی ارادہ تھا کہ عید کے اگلے روز پھر لاہور چلا جاؤں گا" آنے والے وقت کا تو ہم سارے گھر والوں کو خوب اندازہ تھا اور پھر وہ لمحہ آ ہی گیا۔ یہ رمضان کی اٹھارہ تاریخ تھی اور مارچ کے مہینے کی 12 اور 13 تاریخ کی درمیانی رات کہ جب

رات ساڑھے بارہ بجے کہ جب 13 مارچ کو شروع ہوئے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا، مظلوم کے حق میں اور ظالم کے خلاف ہمیشہ گونجنے والی آواز بظاہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔

سوگیا شہر، تو بھی اب سوجا
آپ ڈھل جائے گی یہ شب سوجا
سوگئے خامشی بتاتی ہے
جاگنے والے، سب سے سب سوجا

(جالب)

آخری سفر

فون کی گھنٹی بج رہی تھی، میں نے لائٹ جلائی رات کے اڑھائی بجے تھے۔

ہیلو! میں نے ریسور اٹھایا

لاہور سے آپ کی کال ہے۔ بات کریں، آپریٹر نے اتنا کہا اور پھر میرا بھتیجا مقصود (بھائی مشتاق مرحوم کا منجھلا بیٹا) بولا۔

ہیلو چچا! آپ کھڑے ہیں یا بیٹھے ہیں؟

میں کھڑا ہوں۔ اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں۔ بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔

تو چچا! آپ بیٹھ جائیں۔

مقصود کے کہنے پر میں بیٹھ گیا، اب میرا سر بری طرح گھوم رہا تھا۔

چچا سعید! وہ چچا جالب کا انتقال ہوگیا ہے۔

یہ خبر سننے کے لیے میں ڈیڑھ دو ماہ پہلے سے ہی خود کو تیار کر چکا تھا۔ خصوصاً جالب بھائی کی لندن واپسی کے بعد سے اور میں سوچا کرتا تھا کہ اتنی بھرپور زندگی گزارنے والے کی موت کی خبر میں کیسے سنوں گا اور کیا حالات ہوں گے۔

1947 میں بٹوارے کے بعد کراچی ہمارا آبائی شہر بن گیا تھا۔ ہمارا گھرانہ دہلی سے بذریعہ ٹرین سیدھا کراچی پہنچا تھا۔ جہاں جٹ لائن میں بلاک نمبر 35 کا کوارٹر نمبر 3 مشتاق بھائی کے نام الاٹ ہوا تھا۔ ہماری باہمت، مزدور ماں اسی شہر کی مٹی اوڑھے ابدی نیند سو رہی ہیں۔ (سخی حسن قبرستان)۔

جالب بھائی کے انتقال کی خبر حمید بھائی (جالب اور میرے درمیان کے بھائی) محمود (مشتاق بھائی کا بڑا لڑکا) کو دینا ہے، مجاہد بریلوی اور عزیز میمن بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ جب ہم پونے چھ بجے صبح ہوائی جہاز میں داخل ہوئے تو سامنے اخبارات پڑے ہوئے تھے، جن میں پہلے ہی صفحہ پر انتقال کی خبر نمایاں طور پر شائع کی گئی تھی حبیب جالب انتقال کر گئے۔ حبیب جالب چل بسے۔ حبیب جالب زندگی کی قید سے آزاد ہو گئے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اتنے زندہ انسان کی یہ خبر شائع ہو گی!!!

لو دیکھ لو، پڑھ لو۔

ٹھیک چھ بجے صبح جہاز روانہ ہوا اور جب ہم لاہور ائیر پورٹ سے باہر آ رہے تھے تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ ہم جالب بھائی کے گھر نیلم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن کے لیے ائیر پورٹ سے ٹیکسی میں روانہ ہوئے۔ لاہور شہر کی مانوس سڑکیں، سرسبز راستے بہت خاموش تھے، اداس تھے۔

یہ میرے اندر کی فضا ہے! میں نے خود کو ٹٹولا اور پھر ناصر کاظمی یاد آ گئے۔

دل تو اپنا اُداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

جالب بھائی کے گھر جانے والی گلی کے سامنے ہم ٹیکسی سے اترے۔ جالب کے دو حقیقی بھائی اور ایک بھتیجا، ان قربتوں کو لیے جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو ایک کہرام مچ گیا۔ جالب بھائی کے بچے خصوصاً مجھ سے زیادہ مانوس ہونے کی وجہ سے شدت سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ بڑا بیٹا ناصر منجھلا انور اور چھوٹا یاسر بڑی بیٹی افشاں جو ایک بڑی نظم کا حوالہ بھی ہے "وہ چھوٹی سی تھی کہ ایک

بار بھائی کو پولیس والے ہتھکڑی لگا کر گھر لے آئے تو یہی بچی باپ کی گود میں آ کر ہتھکڑی سے کھیلنے اور ہنسنے لگی اور یوں وہ نظم ہوئی۔

اُس کو شاید کھلونا لگی ہتھکڑی
میری بچی مجھے دیکھ کر ہنس پڑی
یہ ہنسی تھی سحر کی بشارت مجھے
یہ ہنسی دے گئی کتنی طاقت مجھے
کس قدر زندگی کو سہارا ملا
ایک تابندہ کل کا اشارا ملا

لیلیٰ جالب، یہ نام فلسطینی مجاہدہ کو خراجِ عقیدت ہے اور اس بچی کے خط کے جواب میں جالب صاحب نے حیدر آباد جیل سے نظم لکھ کر بھیجی تھی۔

میری بچی میں آؤں نہ آؤں
آنے والا زمانہ ہے تیرا

طاہرہ، رخشندہ اور رجاب فاطمہ، یہ سب ہم سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے، در و دیوار بھی رو رہے تھے، اپنی عظیم بھابھی جالب صاحب کی جدوجہد کی لمحہ لمحہ ساتھی۔ آہنی عزم اور فولادی جثے والی۔ ہماری چچازاد بہن ممتاز آج ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ وہ دھڑام سے فرش پر گری اور بے ہوش ہوگئی۔ آہ و بکا کا شور یک لخت تھم گیا۔ لوگ بھابی کو سنبھال رہے تھے مگر وہ جلد ہوش میں آ گئیں۔ یقیناً ایسا ہی ہونا تھا کیونکہ جالب کی شریک زندگی کو اب دوہری ذمہ داریوں کا بوجھ جو اٹھانا تھا اور ہمارے بھائی نے جاتے جاتے بھابھی سے وعدہ لیا کہ تم میرے بعد بھی حکومت یا کسی ادارے کی کوئی امداد قبول نہیں کروگی۔

تدفین کا پروگرام اخبارات میں شائع ہو چکا ہے، جس کے مطابق نمازِ عصر تقریباً ساڑھے چار بجے شام جالب بھائی گھر سے اپنی ابدی آرام گاہ کی طرف روانہ ہوں گے جو سبزہ زار کالونی کے شاہ فرید قبرستان میں تیار ہو چکی ہے۔

جالب بھائی چھ سات ماہ سے مسلسل ہسپتالوں میں تھے، پہلے تین ماہ سروسز ہسپتال میں رہے۔ جہاں معروف نڈر صحافی نثار عثمانی اور جالب صاحب ایک ہی کمرے میں آمنے سامنے پڑے تھے۔ دونوں کو ایک ہی عارضہ لاحق تھا۔ پھیپھڑوں کی خرابی، سانس کی تکلیف۔ تمام زندگی بھی دونوں کو ایک ہی عارضہ لاحق رہا۔ ''سچ بولنے کا عارضہ۔''

ہسپتال کے ڈاکٹروں نے اپنے بیٹھنے، اٹھنے کا بڑا سا کمرہ، دونوں کے لیے خالی کر دیا تھا۔ سروسز ہسپتال میں تین ماہ رہنے کے بعد جالب بھائی شیخ زید ہسپتال منتقل ہو گئے کیونکہ ان کے خصوصی معالج ڈاکٹر اقبال لندن سے آ چکے تھے۔ اسی ہسپتال میں ایک ماہ گزارنے کے بعد وہ ڈاکٹر اقبال کے ہمراہ روزنامہ جنگ کے میر شکیل الرحمٰن کی وساطت سے لندن روانہ ہوئے۔ جہاں 27 یوم گزارنے کے بعد وہ دوبارہ شیخ زید ہسپتال واپس آ گئے کیونکہ لندن کے کراموبل ہسپتال کے ڈاکٹروں نے انتہائی کمزوری کے باعث آپریشن کو ناممکن قرار دیا تھا۔ لندن سے واپسی کے بعد سے ہی جالب صاحب اور ہم سب اپنے اپنے طور پر سمجھ چکے تھے کہ اب کہانی ختم ہو رہی ہے مگر اس قدر کمزوری کے عالم میں اتنا عرصہ کھینچ جانا اور مسلسل مشق سخن بھی جاری و ساری، یہ جالب ہی کا حوصلہ و ہمت تھی۔ اس وقت مجھے ڈاکٹر اجمل نیازی کا جالب صاحب کے بارے فقرہ یاد آ رہا ہے، جو انہوں نے اپنے کالم میں لکھا تھا ''عمر بھر زندگی بھی حبیب جالب کی منتظر رہی اور اب وہ موت کو بھی انتظار کروا رہا ہے۔''

''چلو جالب بھائی کو ہسپتال سے لے آئیں'' میں نے اپنے بھائی حمید سے کہا ''بس ابھی چلتے ہیں غسل دینے والا آ جائے'' ڈیڑھ دو بجے غسل دینے والے بابا آ گئے، درمیانہ قد سرخ سفید رنگت، ہمارے ابا جی کی طرح مٹھی بھر سفید داڑھی۔

اور پھر میں حمید بھائی اپنے بھتیجوں محمود اور مقصود کے ساتھ ہسپتال روانہ ہو گیا۔ شیخ زید ہسپتال کے استقبالیہ کاؤنٹر پر ہم نے اپنی آمد کا مدعا بیان کیا۔ اس روز جیسے دنیا میں ایک ہی نام کی گونج تھی ''حبیب جالب'' استقبالیہ کلرک نے ہمیں جالب صاحب کی طرف جانے والی راہ دکھائی، ہم

درمیانے قدم اٹھاتے ہوئے اس سرد کمرے میں پہنچے جہاں 'شاعرِ آتش نوا'' ٹھہرا تھا۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا ''ہم گھر والے ایک بار ٹیکسی میں سفر کر رہے تھے ہماری باتوں سے ٹیکسی ڈرائیور سمجھ گیا کہ ہم جالب کے گھر والے ہیں اور پھر وہ بولا کہ '' جالب صاحب اگر کسی عمارت کی جانب اپنا شعر پڑھ دیں تو اس عمارت میں آگ لگ جائے'' ہاں وہی حبیب جالب سرد خانے میں پڑا تھا۔ میں جالب بھائی کو اکثر کراچی ائیرپورٹ پر receive کیا کرتا تھا اور آج بھی ضروری کاغذات پر دستخط کر کے میں ہی یہ فرض بھی ادا کر رہا ہوں۔ میں جالب کے چہرے کو ہاتھوں کو چھو رہا ہوں۔ گزشتہ رات 12 بجے ان کی سانسوں کی ڈور ٹوٹی تھی۔ یوں بارہ گھنٹوں سے زیادہ وقت سے وہ سرد خانے میں موجود ہیں اور ان کے جسم میں ''اکڑاہٹ'' بالکل نہیں ہے۔ ان کے جسم میں لچک موجود ہے۔ چہرہ پر سکون اور ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکان۔

ہم جالب بھائی کو لے کر گھر روانہ ہوئے، میرے سامنے اسٹریچر پر جالب بھائی لیٹے ہوئے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے روزنامہ ''خبریں'' کے سرفراز صاحب مجھ سے جالب صاحب کی تصاویر اور اشعار کے بارے میں پوچھ رہے تھے میں کہ جسے جالب صاحب کا اکثر کلام ازبر ہے انہیں شعر لکھوا رہا ہوں۔

اب رہیں چین سے بے درد زمانے والے
سو گئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

جس وقت میں یہ شعر لکھوا رہا تھا تو قریب بیٹھے احمد راہی صاحب کی آنکھوں میں تیرتی شبنم کو میں بڑا واضح دیکھ رہا تھا۔ یہی شعر جالب بھائی کو اپنے سامنے اسٹریچر پر لیٹے دیکھ کر مجھ یاد آ رہا تھا۔

ایمبولینس گھر کی گلی میں داخل ہوئی تو ایک ہجوم اپنے محبوب شاعر کی جانب لپکا، ایمبولینس رینگتی ہوئی گھر کے دروازے پر پہنچی اور درو دیوار ایک بار پھر رونے لگے۔ جالب صاحب کو غسل کے لیے گھر کے عقبی حصے میں لے جایا جا رہا ہے۔ میں 'حمید بھائی' محمود کے علاوہ دیگر احباب بھی غسل دینے میں معاونت کر رہے ہیں۔ ''سبحان اللہ سبحان اللہ' بخشے ہوئے بندے ہیں جی'' غسال بابا

جالب بھائی کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ ’’جسم تو نرم پڑا ہوا ہے جوڑ جوڑ نرم، ریشم کی طرح‘‘ اور میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت جالب ’’حلقہ یاراں‘‘ میں گھرے ہوئے ہیں ورنہ میں ان کی بہت سی گرفتاریوں کا عینی شاہد ہوں کہ جب بڑی بڑی فورسز انہیں گرفتار کرنے آتی تھیں تو وہ آہنی عزم، آنکھوں میں انقلاب کی چمک، سر اٹھا کر سینہ تان کر گرفتاری دیتے تھے، میرا خیال ہے اگر حضرتِ علامہ کے دور میں جالب اپنے تمام تر کروفر کے ساتھ موجود ہوتے تو حضرت علامہ اقبال اس شعر میں ان کا ’’مومن‘‘ جالب ہوتا ۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے ’’جالب‘‘

لیجئے جالب صاحب کو غسل دے دیا گیا اور انہوں نے سفید براق لباس پہن لیا ہے (زندگی میں بھی گرمیاں سردیاں روز نہانا اور سادہ مگر صاف لباس پہننا ان کا معمول رہا) مگر یہ کیا ان کا منہ کھلا ہے ہونٹ وا ہیں۔ غسال بابا کسی سے کہہ رہے ہیں ’’ان کی تھوڑی کو کپڑے کی لپیٹ میں لے کر سر پر زور سے گرہ لگائیں تاکہ ہونٹ آپس میں مل جائیں اور منہ بند ہو جائے‘‘ احباب غسال بابا کی ہدایت کے مطابق عمل میں مصروف ہیں مگر جالب بھائی کا منہ بند نہیں ہو رہا ہے۔ ہونٹ نہیں سل رہے ہیں۔ میں بات سمجھ چکا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ ’’یہی تو ایک وصف تھا میرے بھائی میں کہ بڑے بڑے سورما آئے انہوں نے لاکھ جتن کر ڈالے مگر اس منہ کو بند نہ کر سکے ان ہونٹوں کو نہ سی سکے‘‘ ’’آپ لوگ بیکار محنت کر رہے ہیں، چھوڑ دیں کیونکہ یہ منہ کھلا ہی رہے گا، یہ ہونٹ وا، ہی رہیں گے‘‘ اور میری بات جیسے سب کی سمجھ میں آ چکی ہے۔ پھر میں نے سرخ گلاب جی ہاں جالب بھائی کا ’’رنگ‘‘ سرخ ان کے گرد پھیلا دیا ہے۔ ’’عہد نامہ لاؤ‘‘ غسال بابا کی آواز بلند ہوئی اور پھر عہد نامہ جالب صاحب کے سینے پر رکھ دیا گیا۔ اس شخص کے سینے پر جس نے زندگی خود سے کیے عہد کے تحت گزاری۔ اس لمحے مجھے جالب بھائی کی کلیات ’’حرفِ سردار‘‘ کا مختصر دیباچہ یاد آ رہا ہے۔ جس کا اختتامی جملہ یوں ہے ’’بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ اے خدا ساتھ ایمان کے

قبر میں اتارنا تو اس کے معنی میں یہی سمجھا ہوں کہ لوگوں سے باندھے گئے پیمانِ وفا پر آخری سانس تک قائم رہنا'' کلمہ شہادت کے نعرہ کے ساتھ اس شخص کا جنازہ اٹھایا جا رہا ہے جس کی لمحہ لمحہ زندگی گواہی ہے۔ ایک بہادر کو اس کی بہادر بیوی اور بیٹیوں کے پاس لایا جا رہا ہے ایک بار پھر آہ وبکا کا شور بین کی آوازیں لوگ کہہ رہے ہیں ''انہیں اچھی طرح رو لینے دو'' انہیں جی بھر کے دیکھ لینے دو۔''

اب آہستہ آہستہ ان کی بیوی اور بچیوں کو ان سے ذرا دور کیا جا رہا ہے۔ تمام خواتین کو بھی ہٹایا جا رہا ہے تا کہ مرد حضرات بھی جالب صاحب کا آخری دیدار کر سکیں۔ لیجیے شیخ رفیق احمد آ رہے ہیں میں کہتا ہوں ''بھائی کے وکیل آ رہے ہیں'' اور پھر شیخ رفیق' عوام کے شاعر کے حضور سر کو احتراماً ذرا سا جھکاتے ہوئے کہہ رہے ہیں ''ایسے بیٹے مائیں روز روز پیدا نہیں کرتیں'' ہاں شیخ صاحب درست کہا آپ نے کہ ایسے بیٹے مائیں روز روز پیدا نہیں کرتیں۔ اماں نے ایک بار لاہور کی ضلع کچہری میں بڑے جلال میں پولیس انسپکٹر سے کہا تھا ''میرے بیٹے کے ہاتھ میں بندھی ہتھکڑی کھول دے یہ بھاگے گا نہیں اس لیے کہ میں نے اسے ہمیشہ جاگتے میں دودھ پلایا ہے یہ بزدل نہیں ہو سکتا۔''

لاہور قیام کے دوران مجھے بھابی نے بتایا کہ آخری دو روز تیرے بھائی مسلسل کہتے رہے ''میری اماں آئی ہے، وہ باہر کھڑی ہے، وہ مجھے لینے آئی ہے، اسے اندر لے آؤ مجھے اماں کے ساتھ جانا ہے، کھڑکیاں دروازے کھول دو، میری اماں آئی ہے۔'' میں نے باہر جا کر اماں سے کہا ''اماں اگر تم میری آواز سن رہی ہو تو واپس چلی جاؤ، اپنے بیٹے کو مت لے جاؤ۔'' میں نے بھابی کی باتیں سن کر انہیں کہا کہ ''بھائی بھی تو رکنے پر تیار نہیں تھے وہ خود کہہ رہے تھے کہ مجھے اماں کے ساتھ جانا ہے۔''

شیخ رفیق کے بعد ایک طویل سلسلہ سیاسی رہنما، شاعر، ادیب، صحافی، وکلا، جج صاحبان، دانشور، سیاسی کارکن، مزدور اور عوام اپنے شاعر کا آخری دیدار کر رہے تھے۔ آج تمام عالمی نشریاتی ادارے اپنے اپنے طور پر ''فکرِ امنِ عالم'' کے شاعر کو رخصت کر رہے تھے اور مجھے اپنے آبائی گاؤں ''میانی افغاناں'' کے قریبی گاؤں ''اُڑمڑ تانڈہ'' کے بابا دولے شاہ صاحب یاد

آ رہے ہیں کہ جنہوں نے عالم جذب میں ''ننھے حبیب'' کے بارے میں کہا تھا ''اس کی خوشبوئیں دور دور ہوں گی''، یہ یکتا ہوگا۔

لوگ جالب صاحب کا آخری دیدار کر رہے ہیں اور میں بھیگی آنکھوں کے ساتھ گلی میں آتا ہوں میرا بھتیجا مقصود میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے ''سعید چچا موسم اچانک بدل گیا ہے، کالے بادل چھا گئے ہیں۔ بارش کی صورت میں کیا ہوگا'' میں اس سے کہتا ہوں ایمبولینس کا انتظام کر لیتے ہیں اور پھر ہم مقصود کی جیپ میں ایمبولینس لینے نکل جاتے ہیں۔

موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ کڑکتی دھوپ میں ہم جالب صاحب کو ہسپتال سے گھر لائے تھے یہ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کیوں دھار و دھار رونے لگا۔ مقصود نے جیپ ایک طرف روک دی ہے۔ بارش اس قدر تیز ہے کہ سفید چادر سی آنکھوں کے سامنے تن گئی ہے۔ ایسے میں جیپ نہیں چلائی جا سکتی۔ ہمیں بارش کا زور ٹوٹنے کا انتظار کرنا ہوگا۔

آدھ پون گھنٹہ کے بعد بارش رکی آسمان خاصا کھل کر رو چکا ہے مگر سسکیاں اب بھی بھر رہا ہے۔ بارش کا زور ٹوٹ چکا ہے لیکن پھوار جاری ہے۔ ہم جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ چند قدم کے فاصلے پر ایدھی ایمبولینس اسٹیشن ہے۔ جہاں سے ایمبولینس لیکر ہم گھر کی جانب لوٹ رہے ہیں۔ ہلکی ہلکی بارش اب بھی ہو رہی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جالب صاحب کو ان کی آخری آرام گاہ پہنچانے کے لیے روانہ ہوا جائے۔ کلمہ ء شہادت کے ساتھ جالب صاحب گھر سے روانہ ہوتے ہیں۔ گلی کے دونوں اطراف مکانوں کے شیڈز کے نیچے کھڑے ملک کے مختلف شعبوں کے نامور لوگ کندھا دینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں مگر جالب صاحب کو ایدھی ایمبولینس کے ذریعے لے جایا جا رہا ہے۔ لوگوں کا ہجوم ایمبولینس کے آگے پیچھے چل رہا ہے۔ کاریں، ویگنیں، موٹر سائیکلیں ایک لمبے جلوس کی قیادت جالب صاحب کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال ٹاؤن سے سبزہ زار کالونی، شاہ فرید قبرستان کا ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کر کے جلوس جنازہ، نماز کے لیے قبرستان کی مسجد کے باہر رک گیا ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار اب بھی جاری ہے۔ نماز کے

لیے قطاریں بنائی جارہی ہیں۔ قبرستان پہنچنے والوں کو جالب صاحب کا دیدار کروایا جارہا ہے۔
یہاں سے جالب صاحب کی ابدی آرام گاہ چند قدم کے فاصلے پر ہے اور یہاں سے جالب صاحب کو ان کے عشاق کندھا دیکر لے جارہے ہیں۔

یہ کون ہے! سرخ سفید، گورا چٹا، جسم پر کھدر کا لباس، کھدر کی چادر گلے میں لپیٹ کر بازو پر ڈالے، یہ شخص ایک منڈیر پر کھڑے ہوکر بالکل عسکری انداز میں جاتے ہوئے جالب کے جنازے کو سلامی دے رہا ہے۔ لوگوں کی دھیمی دھیمی آوازیں میرے کانوں تک بھی پہنچتی ہیں، ''یہ خاکسار لطیف بٹ ہے''

جالب صاحب کو ان کی قبر کے بالکل قریب پہنچا دیا گیا ہے ابدی آرام گاہ جالب کو لینے کے لیے بالکل تیار ہے۔ عبدالعزیز میمن اور مصطفیٰ قریشی (اداکار) تمام کام اپنی نگرانی میں کروا رہے ہیں۔

جالب کس کے سہارے چھوڑ کے جارہے ہو، ہم کسے اپنا غم سنائیں گے'' ''کون ہماری غم گساری کرے گا'' یہ آہ و بکا وہی خاکسار لطیف بٹ کر رہا ہے۔ اعتزاز احسن رو رہے ہیں، احمد ندیم قاسمی صاحب کی نظریں جالب کی قبر پر گڑ کر رہ گئی ہیں۔ دمے کے مریض شیخ رشید (سینئر وائس چیئرمین پی پی پی) مسلسل بارش میں بھیگ رہے ہیں۔ سرد ہوائیں چل رہی ہیں مگر سب موسم سے بے نیاز کھڑے ہیں عوام کے شاعر کو مٹی کے سپرد کیا جارہا ہے۔ امجد اسلام امجد کی نظم کے آخری چار مصرے درج کرتے ہوئے آگے بڑھوں گا۔

جس آوارہ دیوانے کو جالب کہتے تھے
ہستی کی اس راہ گزر سے اب وہ جاتا ہے
اے مٹی، اے ارض وطن، لے اپنی باہیں کھول
تیری جانب لوٹ کے تیرا شاعر آتا ہے

روزنامہ خبریں کی سرخی کا ذکر بھی کروں گا ''روتے موسم میں حبیب جالب ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہوگئے'' روزنامہ جنگ نے سرخی جمائی ''آسمان اور آنکھوں سے برستے آنسوؤں میں جالب کو سپردِ خاک کردیا گیا'' روزنامہ نوائے وقت ''آسمان کی شبنم افشانی، جالب

آسودہ خاک ہو گئے'' روزنامہ پاکستان ''ہم آوارہ گاؤں گاؤں بستی بستی پھرنے والے'' جالب کے اس مصرعے کے نیچے سرخی لگائی ''حبیب جالب دنیا اور اس کی گلیاں چھوڑ گیا'' روزنامہ مشرق ''جالب چاک گریباں زندگی کی رہ گزر سے بالآخر وادیٔ عدم میں اتر گیا۔'''' ان چند اخبارات کی دو کالمی سرخیوں کے بعد اب ''آخری سفر کی چند ساعتوں کا اور احوال'' شیخ رشید بیماری و کمزوری کے باوجود جالب کی قبر کو مٹی دینے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ بارش کی وجہ سے پھسلن بہت ہو گئی ہے۔ لوگ انہیں پکڑ کر سہارا دے رہے ہیں۔ انہیں آگے بڑھنے سے روکا جا رہا ہے۔ مگر وہ مٹی دینے کے لیے بضد ہیں خاکسار لطیف بٹ نے قبر کو مٹی دینے کے بعد مٹی کو اپنے منہ پر مل لیا ہے۔

مٹی دینے کا عمل ختم ہو چکا ہے اور اب عشاقِ جالب قبر پر پھول چڑھا رہے ہیں اور مجھے جالب کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

نہ کوئی شب ہو شبِ غم، یہ سوچتے ہیں ہم
کسی کی آنکھ نہ ہو نم، یہ سوچتے ہیں ہم

تدفین کے بعد، احباب واپس ہو رہے ہیں چند قدم چل کر سب رک گئے ہیں سب کا رخ جالب کی آخری وابدی آرام گاہ کی طرف ہے اور وہاں سے آوازِ جالب آ رہی ہے۔

پھر کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
ہم ترا شہر چھوڑ جائیں گے
آخری بار اک غزل سن لو
آخری بار ہم سنائیں گے
صورت موجۂ ہوا جالب
ساری دنیا کی خاک اڑائیں گے

حبیب جالب فلم نگر میں

یہ 52-1951 کا واقعہ ہے جالب ان دنوں رائل پارک لاہور میں فلم ساز مرتضیٰ جیلانی اور اداکار آزاد کے ساتھ رہ رہے تھے ہدایت کار انور کمال پاشا فلم ''دو آنسو'' بنا رہے تھے حبیب جالب کہتے ہیں:

(43) ''فلمساز مرتضیٰ جیلانی نے مجھے ایک مصرعہ دیا۔

اک حال پر ہمیشہ رہتا نہیں زمانہ

جیلانی صاحب نے دوسرا مصرعہ لگانے کو کہا میں نے دوسرا مصرعہ یوں لگایا۔

کیوں ہنس رہی ہے دنیا سن کر مرا فسانہ
اک حال پر ہمیشہ رہتا نہیں زمانہ

جیلانی صاحب نے اس مصرعے کے مجھے تھوڑے، بہت پیسے دیے، پھر جب میں کراچی چلا گیا تو آزاد صاحب نے ''طوفان کے بعد'' نام سے فلم کا آغاز کیا، موسیقار خلیل احمد بھی کام کی تلاش میں تھے، آزاد صاحب نے خلیل احمد سے پوچھا ''تم باجا بجا لیتے ہو؟'' خلیل احمد نے کہا ''ہاں'' اس پر آزاد بے ساختہ بولے ''تو بس پھر آج سے تم میوزک ڈائریکٹر ہو'' خلیل احمد کی موسیقی میں نذیر بیگم نے دوگانے ریکارڈ کروائے۔ مگر فلم نہ بن سکی۔''

یوں حبیب جالب کا فلم نگر میں داخلہ ہوا۔ فلم ''طوفان کے بعد'' کے ایک گانے کا مکھڑا مجھے ابھی تک یاد ہے۔

''فلک والے، تماشا دیکھتا جا، غم کے ماروں کا''

خلیل احمد مرحوم کے بھائی کفیل احمد آرٹس کونسل کراچی میں مجھے دو تین سال قبل سالانہ الیکشن

کے موقع پر ملے، تو انہوں نے بتایا کہ اس گانے کو خلیل احمد صاحب نے اسی طرز میں ریکارڈ کیا تھا جس طرز میں فلم ''لوری'' کا گیت مہدی حسن صاحب کی آواز میں ریکارڈ ہوا تھا'' خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں'' اس خوبصورت گیت کے شاعر حمایت علی شاعر تھے اور ''لوری'' کے وہ فلم ساز بھی تھے لیکن جالب صاحب کی بطور فلمی نغمہ نگار جو پہلی فلم ریلیز ہوئی اُس کا نام ''مِس 56 '' تھا۔ روپ کے شوری اس کے ہدایت کار تھے۔ موسیقار جی اے چشتی تھے اور اس گیت کو مہدی حسن اور نذیر بیگم نے گایا تھا۔ گیت کے بول تھے۔

یہ چاندی، یہ سائے
پہلو میں تم ہو میرے
پھر کیوں نہ پیار آئے

اس کے بعد جالب صاحب اداکار علاؤ الدین کے کہنے پر لاہور چلے گئے اور انہی کے گھر پر قیام کیا۔ اداکار علاؤ الدین جالب صاحب کو روزانہ پانچ روپے دیتے تھے کہ گھومو پھرو اور تمہارے لیے نغمہ نگاری کی بات بھی ہوتی رہے گی۔

ایک روز جالب صاحب رائل پارک لکشمی چوک، میکلوڈ روڈ پر پان کی دکان کے پاس کھڑے تھے کہ ایک صاحب آئے اور جالب سے کہا'' آپ کو ہدایت کار جعفر شاہ بخاری بلا رہے ہیں'' جالب صاحب کو اس طرح بلانا اچھا نہیں لگا اور انہوں نے کہا'' ان سے کہو وہ خود یہاں آجائیں'' اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہدایت کار جعفر شاہ بخاری اپنی کار میں اپنی بیگم (اداکارہ یاسمین) کے ساتھ وہاں آگئے اور جالب صاحب سے اپنے تعارف کے بعد کہا کہ علاؤ الدین صاحب نے آپ کا ذکر کیا تھا اور ہم آپ سے فلم کے لیے گانے لکھوانا چاہتے ہیں اور آپ ہماری ساتھ اسٹوڈیو چلیں۔ جالب صاحب ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گئے۔ شاہ نور اسٹوڈیو پہنچے تو فلم ساز، ہدایت کار جعفر شاہ بخاری نے اپنی فلم کے موسیقار اے حمید سے جالب صاحب کو ملوایا۔ اے حمید جعفر شاہ بخاری سے بولے'' انہیں دو روز بعد بلوالیں'' جالب کی خودداری والی رگ پھر پھڑک گئی اور انہوں نے اے حمید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا'' میں اس شخص کے ساتھ بیٹھنا ہی نہیں چاہتا اور یہ مجھے دو

روز بعد کا ٹائم دے رہا ہے'' اس نازک موڑ پر اداکارہ یاسمین جو بڑی سخن فہم تھیں نے مداخلت کی اور جعفر شاہ بخاری نے بھی بڑی ہوا باندھی کہ بھئی ''بطور خاص کراچی سے انہیں بلوایا گیا ہے''

یوں جالب صاحب اور موسیقار اے حمید کے درمیان خوش گوار ماحول پیدا کیا گیا۔ اب جالب صاحب نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا کہ میں تو بغیر ''موڈ'' کے لکھتا نہیں'' لہٰذا ''موڈ'' کے بندوبست کے لیے سید شوکت حسین رضوی سے جعفر شاہ بخاری ملے اور انہیں بتایا کہ حبیب جالب بغیر موڈ کے گانا نہیں لکھ سکتے۔ شوکت رضوی صاحب اسی وقت اٹھے اور چل دیے کہ یقیناً کوئی اچھا شاعر ہے جو ''موڈ'' میں آنے کے بعد لکھتا ہے۔

جالب صاحب کو جس گیت کے لکھنے کے لیے خاص طور سے بلوایا گیا تھا اس کے لیے کچھ نغمہ نگار کوشش کر چکے تھے مگر وہ ہدایت کار کی requirement پر پورا نہیں اتر رہے تھے۔

جالب صاحب نے اس گیت کا مکھڑا لکھا۔

ڈستی ہیں یہ تنہائیاں
روئے میرا دل تو ہے کہاں

پورا گیت تو مجھے یاد نہیں، بس ایک بند یاد ہے اور یہ گیت جالب صاحب کے فلمی گیتوں پر مشتمل کتاب ''رقصِ زنجیر'' میں بھی نہیں ہے گیت کا بند یوں ہے۔

او بے وفا، کیوں ہے خفا
آ کے مجھے یہ بتا دے ذرا
تو نے کہا تھا، مہندی رچے گی
اور بجیں گی، شہنائیاں
روئے میرا دل تو ہے کہاں

اور کچھ آگے یوں تھا کہ۔

آنکھوں میں آنسو، ہونٹوں پہ آہیں
تقدیر میں رسوائیاں
روئے میرا دل تو ہے کہاں

لاہور میں جالب کی بطور فلمی نغمہ نگار اس پہلی فلم کا نام ''بھروسہ'' تھا اس فلم کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ بطور کہانی نویس ریاض شاہد کی بھی یہ پہلی فلم تھی۔ اس فلم میں جالب صاحب نے تین گیت لکھے اور منہ مانگے پیسے انہیں دیے گئے جو فی گیت 300 روپے تھے اور یہ معاوضہ اس زمانے کے لحاظ سے بہت زیادہ تھا۔ تین گیتوں کے 900 روپے ملے تو جالب صاحب نے بیوی اور والدین کو بھی لاہور بلوالیا۔ یہی فلم بھروسہ تقریباً بیس بائیس سال بعد دوبارہ ''سماج'' کے نام سے بنی۔ اس فلم میں بھی جالب نے دو گیت لکھے ایک گیت مہدی حسن کی آواز میں اور موسیقار اے حمید کی موسیقی میں ہٹ ہوا۔

یہ اعجاز ہے، حسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

سماج کے فلم ساز ہدایت کار بھی جعفر شاہ بخاری تھے اور موسیقار بھی اے حمید تھے اور یہ فلم بھی باکس آفس پر کامیاب رہی۔

جالب صاحب نے فلم نگر میں بھی اپنے نظریات کو ہی پیشِ نظر رکھا۔ اسی لیے انہوں نے فلموں میں کم لکھا ان کی سیاسی سرگرمیاں اور جیل یاترائیں بھی آڑے آتی رہیں۔ فلم نگر میں اس زمانے میں انقلابی خیالات رکھنے والوں کا ایک گروپ تھا جو مل کر کام کرتا تھا۔ علاؤالدین، طالش، خلیل قیصر، ریاض شاہد، رشید عطرے، ساقی، حسن شاہ اور حبیب جالب ان لوگوں نے شہید، فرنگی، زرقا، یہ امن جیسی فلمیں بنائیں، زرقا اور یہ امن کے گیت حبیب جالب نے لکھے تھے جن میں جالب نے اپنے خیالات ور جحانات کو بھرپور انداز میں پیش کیا اور فلم کے مضبوط میڈیا کے ذریعے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ریاض شاہد، جالب سے کہا کرتے تھے ''تم سامراج کے خلاف کھل کر لکھو، میں اسے سلولائیڈ پر منتقل کروں گا''، فلم زرقا، فلسطین کے موضوع پر بنائی گئی فلم تھی۔ فلم کا ٹائیٹل سانگ جالب کی پہلے سے کہی گئی نظم کو گیت کا روپ دیکر situation کے مطابق ڈھالا گیا تھا۔ اس گیت کو امر بنانے میں موسیقار رشید عطرے کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے جس طرح انقلابی تراکیب اور لفظوں کو رشید عطرے نے موسیقی میں ڈھالا ہے وہ انہی کا حق تھا اصل نظم کے ہوتے ہوئے گیت نے بھی اپنا اثر قائم رکھا ہے۔ فلمی گیت ملاحظہ ہو۔

تو کہ ناواقفِ آداب غلامی ہے ابھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
آج قاتل کی یہ مرضی ہے کہ سرکش لڑکی
سرِ مقتل تجھے کوڑوں سے نچایا جائے
موت کا رقص زمانے کو دکھایا جائے
اس طرح ظلم کو نذرانہ دیا جاتا ہے
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

دیکھ فریاد نہ کر، سر نہ جھکا، پاؤں اٹھا
کل کو جو لوگ کریں گے تو ابھی سے کر جا
ناچتے ناچتے آزادی کی خاطر مرجا
منزلِ عشق میں، صر صر کے جیا جاتا ہے
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

اسی طرح فلم زرقا کے یہ گیت بھی انقلابی پیغام اور معنویت کے حوالے سے بڑے بھرپور گیت تھے۔

ا۔ میں پھول بیچنے آئی

۲۔ ہمیں یقیں ہے ڈھلے گی اک دن ستم کی یہ شام اے فلسطین

فلم ''یہ امن'' ریاض شاہد کی کشمیر کے پس منظر میں بنائی گئی فلم تھی۔ اس فلم میں ٹائیٹل سانگ بین الاقوامی پیغام کا حامل گیت تھا۔ جالب کہتے ہیں:

(44) ''نور جہاں نے میرے بے شمار گیت گائے ہیں مگر مجھے اس دن بہت خوشی ہوئی جس دن انہوں نے میرا یہ نغمہ گایا۔ میں نے میڈم نور جہاں سے کہا کہ اب تک آپ نے میرے جتنے نغمے گائے وہ بہت اچھے ہیں لیکن اس گیت کی فضا کچھ اور ہے یہ ان سے الگ ہے یہ ایک انٹرنیشنل تھاٹ کا گانا ہے میں نے یہ لکھا بھی تھا کہ اس کا تخیل روس اور چین کے تناظر میں ہے۔''

یہ گیت بھی جالب کی پہلے سے لکھی نظم کو گیت کے سانچے میں ڈھال کر بنایا گیا۔ ملاحظہ ہو اس

گیت کو مہدی حسن نے بھی گایا تھا۔

ظلم رہے اور امن بھی ہو
کیا ممکن ہے تم ہی کہو

ہنستی گاتی روشن وادی
تاریکی میں ڈوب گئی
بیتے دن کی لاش پہ اے دل
میں روتی ہوں، تو بھی رو
ظلم رہے اور امن بھی ہو

ہر دھڑکن پر خوف کے پہرے
ہر آنسو پر پابندی
یہ جیون بھی کیا جیون ہے
آگ لگے، اس جیون کو
ظلم رہے اور امن بھی ہو
اپنے ہونٹ سیے ہیں تم نے
میری زباں کو مت روکو
تم کو اگر توفیق نہیں تو
مجھ کو ہی سچ کہنے دو
ظلم رہے اور امن بھی ہو

ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں گلوکار سلیم رضا فلم کے بہترین پلے بیک سنگر مانے جاتے تھے۔ سلیم رضا نے اس دور میں جالب صاحب کے لکھے ہوئے درج ذیل گیت گائے جو بڑے مقبول ہوئے:۔

ا۔ بنا کے میرا نشیمن جلا دیا تو نے۔ فلم: دوراستے، موسیقار: ماسٹر عنایت حسین

۲۔ میرے دل کی انجمن میں ترے غم سے روشنی ہے۔ فلم: قیدی، موسیقار: رشید عطرے

۳۔اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے، فلم: موسیقار، موسیقار: رشید عطرے

۴۔بھول جاؤ گے تم کرکے وعدہ صنم۔فلم: سیما، موسیقار: ماسٹر عنایت حسین

اسی زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ مجھے موسیقار نذیر علی نے سنایا، یہ اسّی، اکیاسی کی بات ہے میں جالب صاحب کے ساتھ ایورنیو اسٹڈیوز گیا تھا کہ سامنے سے موسیقار نذیر علی آ گئے ''اس زمانے میں نذیر علی کا کمپوز کیا ہوا گیت ''سیونی میرا ماہی میرے بھاگ جگاون آ گیا'' سپر ہٹ تھا۔ جالب صاحب نے نذیر علی کے کام کی داد دینے کے خیال سے بڑے موڈ میں کہا'' بھئی کبھی ہم سے بھی گیت لکھوالیا کرو'' تو نذیر علی ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولے''ایک واقعہ سن لیں۔ یہ ساٹھ کی دہائی کا واقعہ ہے میں اس زمانے میں موسیقار منظور اشرف کے ساتھ ڈھولک بجاتا تھا۔ ان دنوں ہدایت کار منور رشید صاحب کی فلم ''کون کسی کا'' بن رہی تھی بلکہ تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ صرف ایک گانا رہتا تھا جس کے لیے چار ماہ سے جالب صاحب کو تلاش کیا جا رہا تھا۔ مگر وہ ہاتھ نہیں آ رہے تھے۔ آخر ایک روز ہدایت کار منور رشید اور میوزک ڈائریکٹر منظور اشرف نے مجھے کہا کہ اگر تم جالب صاحب کو لے آؤ تو ہم بطور انعام تمہیں سو روپے دیں گے اور آنے جانے کا کرایہ اس کے علاوہ۔ اس زمانے میں سو روپیہ بہت بڑی رقم ہوتی تھی اور مجھ غریب آدمی کے لیے تو خاص طور پر بڑی رقم تھی سو میں نے ان کی بات مان لی اور سرِ شام ہی جالب صاحب کے گھر کے باہر بیٹھ گیا کہ جالب صاحب گھر تو آئیں گے۔۔ میں بھوکا پیاسا ان کے گھر کے باہر بیٹھا رہا حتیٰ کہ رات دو اڑھائی بجے جالب صاحب ایک رکشے میں آئے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور ان سے عرضِ حال بیان کیا کہ ''حضور آپ میرے ساتھ چلیں گے تو مجھ کو سو روپے انعام کے مل جائیں گے'' جالب صاحب تھکے ہارے گھر پہنچے تھے اور انہوں نے مجھ سے کہا'' بھئی تم فکر مت کرو، سو روپیہ انعام تمہیں ملے گا اور میں کل اسٹوڈیو پہنچ جاؤں گا'' میں نے سوچا کہ اگر جالب صاحب نہ پہنچ سکے، بھول گئے تو میری محنت رائیگاں اور انعام کے سو روپے بھی مارے جائیں گے سو میں نے جالب صاحب کی منت کرتے ہوئے کہا'' جالب صاحب ابھی اسٹوڈیو

چلیں وہاں سب لوگ آپ کے منتظر ہیں'' اور جالب صاحب میرے بے پناہ اصرار پر اسی رکشے میں بیٹھ کر میرے ساتھ اسٹوڈیو آ گئے۔ یوں مجھے میرے انعام کے سو روپے اور کرایہ رکشہ بھی مل گیا۔'' اور عوام کو ایک ''اسٹریٹ سانگ'' مل گیا فلم ''کون کسی کا'' کا یہ نغمہ اس دور کا مشہور نغمہ تھا۔

دے گا نہ کوئی سہارا
ان بیدرد فضاؤں میں
سوجا غم کی چھاؤں میں

اس گانے کو نسیم بیگم، آئرن پروین اور مسعود رانا نے گایا تھا اور یہ فلم کا ٹائیٹل سانگ تھا موسیقار نذیر علی کا واقعہ سنانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس دور کے فلم ساز، ہدایت کار بڑے devotion کے ساتھ کام کرتے تھے انہیں خوب احساس تھا کہ کون سا گیت کس شاعر سے لکھوانا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ جالب نے فلم کو بھی اپنے رجحانات کے پھیلاؤ کا ذریعہ بنایا۔ اس کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں فلم ''ساز و آواز'' میں میڈم نور جہان کا گیت، موسیقار حسن لطیف۔

کیوں کہیں یہ ستم، آسماں نے کیے
آسماں سے ہمیں کچھ شکایت نہیں
دکھ ہمیں جو دیے، اس جہاں نے دیے

چند لوگوں کے ہاتھوں میں ہے زندگی
چھین لیتے ہیں جب چاہتے ہیں خوشی
اونچے اونچے گھروں میں ہے جو روشنی
جل رہے ہیں ہمارے لہو کے دیے

لاکھ چلتی رہے، یہ ہوائے ستم
دیپ بجھنے نہ دیں گے، محبت کا ہم
دیکھنا بیت جائے گی شامِ الم
جی رہے ہیں، یہی آس دل میں لیے

فلم ''پرائی آگ'' میں مہدی حسن کا گایا ہوا گیت موسیقار: خواجہ خورشید انور

اے شامِ غم بتا کہ سحر کتنی دور ہے
آنسو نہیں جہاں، وہ نگر کتنی دور ہے
دم توڑتی نہیں ہے، جہاں پر کسی کی آس
وہ زندگی کی راہ گزر، کتنی دور ہے
اب کوئی پاسباں، نہ کوئی اپنا ہم سفر
منزل ہماری کس کو خبر کتنی دور ہے
کوئی پکارتا ہے، تجھے کب سے اے خدا
کہتے ہیں تو ہے پاس، مگر کتنی دور ہے

فلم ''گھر پیارا گھر'' گلوکار مجیب عالم، موسیقار: نثار بزمی۔

بجھے نہ دل، رات کا سفر ہے
یہ نا سمجھ لوگ بے خطا ہیں
ہمارے غم کی کسے خبر ہے

رات کا سفر ہے

دکھائیں داغ اپنے کس کو اے جاں
یونہی لٹے ہیں، ہمارے ارماں
رہے ہیں تر، آنسوؤں سے داماں
ہر ایک چھلنی یہاں جگر ہے

رات کا سفر ہے

گلہ نہ کر ان دکھے دلوں کا
انہیں پتہ کب ہے منزلوں کا
قدم قدم پر ہیں غم کے مارے
یہ غم کا طوفاں، ڈگر ڈگر ہے

رات کا سفر ہے

ہنسیں گی سہمی ہوئی نگاہیں

چمک اٹھیں گی، وفا کی راہیں
ہزار ظالم سہی اندھیرا
سحر بھی لیکن قریب تر ہے، قریب تر ہے، قریب تر ہے

فلم ''خاموش رہو'' موسیقار خلیل احمد، گلوگار: ناہید نیازی۔

جاگنے والو، جاگو، مگر خاموش رہو
کل کیا ہوگا، کس کو خبر خاموش رہو
کس نے سنی ہے، اس نگری میں دل کی بات
کس پہ ہوا، آہوں کا اثر خاموش رہو
رات کے بعد، اک رات نئی آجائے گی
اس گھر میں ہوگی نہ سحر، خاموش رہو
ظلم کے پہرے، خوف کے سائے، سر پہ رہیں
ہوجائے گی عمر بسر، خاموش رہو

حتیٰ کہ حبیب جالب نے ایک خالص romantic منظر میں بھی اداکار وحید مراد اور اداکارہ رانی پر فلمائے گئے اس گیت کے آخر میں اپنی بات شامل کردی گلوکار، مہدی حسن، موسیقار نثار بزمی اور فلم ناگ منی، ہیرو، ہیروئن کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہے۔

میرا ایمان محبت ہے، محبت کی قسم
ساری دنیا ترے قدموں پہ نچھاور کردوں

اور پھر دوسرے بند میں کہتا ہے۔

وہ جہاں ایک جہنم ہے، جہاں تو نہ ملے

اور ایسی رومان پرور فضاء میں جالب ایک ''بہت بڑے رومان'' کو یوں شامل کرتے ہیں۔

مسکرا جانِ بہاراں، کہ سویرا ہوگا
ختم صدیوں کے رواجوں کا اندھیرا ہوگا
شب کی تقدیر میں لکھا ہے گزر ہی جانا
راہ سورج کی، کہاں، روک سکے اہلِ ستم
میرا ایمان محبت ہے، محبت کی قسم

مندرجہ بالا نغمات کے علاوہ حبیب جالب کے مشہور فلمی نغمات کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ یہ اعجاز ہے حسنِ آوارگی کا۔۔ فلم: سماج، موسیقار: اے حمید، گلوکار: مہدی حسن

۲۔ داغ وہ ہم کو ملا جینے سے نفرت ہوگئی۔۔ فلم سماج، موسیقار، اے حمید،
گلوکار: مہدی حسن

۳۔ تن تو پہ واروں من تو پہ واروں۔۔ فلم، ناگ منی، موسیقار، نثار بزمی،
گلوکار نور جہاں

۴۔ من میں اٹھی نئی ترنگ۔ فلم، ناگ منی، موسیقار، نثار بزمی، گلوکار،
نور جہاں و ساتھی

۵۔ آج اس شہر میں کل نئے شہر میں۔۔ فلم، جوکر، موسیقار، مصلح الدین،
گلوکار: احمد رشدی

۶۔ اس درد کی دنیا سے گزر کیوں نہیں جاتے۔ فلم، زخمی، موسیقار، اے حمید،
گلوکار: مہدی حسن

۷۔ مل گئی آسماں سے زمیں۔۔ فلم پرائی آگ، موسیقار، خواجہ خورشید انور،
گلوکار، نسیم بیگم

۸۔ لوگ دیکھیں نہ تماشا میری تنہائی کا۔ فلم، ماں بہو اور بیٹا، موسیقار، حسن لطیف،
گلوکار، نور جہاں

۹۔ اب اور پریشاں دلِ ناشاد نہ کرنا۔ فلم، ماں بہو اور بیٹا، موسیقار، حسن لطیف،
گلوکار، مہدی حسن

۱۰۔ اس بے وفا نے داغ تمنا دیا مجھے۔ فلم، ماں بہو اور بیٹا، موسیقار، حسین لطیف،
گلوکار، مہدی حسن

۱۱۔ بے وفا ہیں صنم آج کل کے۔۔ فلم، عورت ایک کہانی، موسیقار، قصوم رحیم، گلوکار،

نسیم بیگم، نسیمہ شاہین اور ساتھی

۱۲۔ سنگیت نہ جانے دکھلائے گا کب تک ہمیں۔۔ فلم ساز و آواز، موسیقار،

حسین لطیف، گلوکار، مہدی حسن

۱۳۔ ہمیں یقیں ہے ڈھلے گی اک دن ستم کی یہ شام اے فلسطین۔۔ فلم،

زرقا، موسیقار، رشید عطرے، گلوکار، منیر حسین، نسیم بیگم

۱۴۔ خدارا محبت محبت نہ کرنا۔۔ فلم، محبت، موسیقار، اے حمید، گلوکار، احمد رشدی

۱۵۔ میں پھول بیچنے آئی۔۔ فلم، زرقا، موسیقار، رشید عطرے، گلوکارہ، نسیم بیگم

۱۶۔ لو وہ چلی ڈولی میں اسون کی۔ فلم گھر پیارا گھر، موسیقار، نثار بزمی، گلوکار، مہدی حسن

۱۷۔ اپنی جنگ رہے گی۔۔ فلم، یہ امن، موسیقار، اے حمید، گلوکار، مہدی حسن و ساتھی

حبیب جالب نے تقریباً تین سو فلمی گیت لکھے ان کے لکھے ہوئے بہت سے گیتوں کا ریکارڈ ان کی فلمی گیتوں پر مشتمل کتاب ''رقصِ زنجیر'' میں دستیاب نہیں ہے جس کا اعتراف کتاب کے ناشر نے بھی کیا ہے ان کی ابتدائی فلموں ''میں نے کیا جرم کیا'' ''یہودی کی لڑکی'' ''کھل جا سم سم، سن آف علی بابا'' ''تیرے شہر میں'' ''عورت ایک کہانی'' ''فریاد'' وغیرہ کے نغمات ابھی منظرِ عام پر آنا باقی ہیں۔ حبیب جالب نے پنجابی فلمی گیت بھی لکھے ہیں۔ ان کا تذکرہ بالکل علیحدہ مضمون چاہتا ہے۔

اور آخر میں ایک خاص واقعہ آپ کو ضرور سنانا چاہوں گا۔ اور وہ بھی ممتاز کالم نگار حامد میر کی زبانی۔ حامد میر اپنے کالم بعنوان ''دیوانہ شاعر'' سرکش ملکہ'' میں لکھتے ہیں:

(45) ''کسی زمانے میں نور جہاں نے ایک گیت گایا تھا۔

ظلم رہے اور امن بھی ہو
کیا ممکن ہے تم ہی کہو

ہنستی گاتی روشن وادی
تاریکی میں ڈوب گئی

بیتے دن کی لاش پہ اے دل
میں روتی ہوں، تو بھی رو
ظلم رہے اور امن بھی ہو

یہ گیت حبیب جالب نے لکھا تھا اور گیت میں جس روشن وادی کے تاریکی میں ڈوبنے پر آنسو بہائے گئے وہ وادئ کشمیر تھی۔ حبیب جالب نے اپنی سوانح عمری ''جالب بیتی'' میں لکھا ہے کہ نور جہاں نے ظلم کے خلاف اس گیت کو اتنی تڑپ سے گایا کہ یہ گیت ایک نعرہ بن گیا۔

جس شاعر کا شعر اور گانے والی کی آواز سچے جذبوں کو بیدار کر دے اور حق و باطل کی جنگ میں فریق بن جائے ان کی بخشش کی راہیں خود بخود کھل جاتی ہیں۔

ایک دفعہ میں نے جالب صاحب سے پوچھا کہ ''نور جہاں اپنی شہرت کی بلندیوں پر ہے، فلموں کے پروڈیوسر اور موسیقاران سے گانے کا وقت لینے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں، نور جہاں کے گانوں کا شیڈول کئی کئی ماہ پہلے طے ہو جاتا ہے لیکن آپ جب فون کرتے ہیں وہ آپ کو فوراً ملاقات کا وقت دے دیتی ہیں اور آپ چار دوستوں کو ساتھ لے جاتے ہیں ایک پیسہ نہیں خرچ کرتے اور نور جہاں سے تین چار فرمائشی غزلیں سن کر واپس چلے آتے ہیں'' جالب صاحب نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا ''یہی سوال میں نے بھی ایک دفعہ میڈم نور جہاں سے پوچھا تھا '' کہ آپ زنانی ہو کر بڑے بڑے تیس مار خان پروڈیوسروں کو مردانہ گالیاں نکالتی ہو۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی لیکن میری گستاخیوں کو نخرا سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہو آخر کیوں؟'' تو میڈم نور جہاں نے جواب میں کہا'' جالب صاحب آپ کے ساتھ عشق لڑانا ممکن نہیں کیونکہ آپ کو عورت کے عشق میں ذلیل و خوار ہونا نہیں آتا۔ آپ تو سچے شعر کہہ کر لاٹھیاں کھانے اور جیلوں میں جانے والے دیوانوں میں سے ایک ہیں اور آپ جیسے دیوانوں کی خدمت میں خوشنودی حاصل کرنا میرے لے باعثِ فخر ہے''

ایک دفعہ اخبارات میں ایک تصویر شائع ہوئی۔ جس میں مرحوم جنرل ضیاء الحق نے نو جہاں کا اپنے ہاتھوں میں لیکر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ یہ تصویر دیکھ کر جالب صاحب نے میڈم نور جہاں کو

فون کیا اور کہا ''جس شخص کے خلاف ہم صبح و شام لکھتے ہیں آپ نے اُسی کے ہاتھوں میں ہاتھ دے دیا۔'' میڈم نے جواب دیا ''ضیاء صاحب نے خود میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ آپ تشریف لائیے میں آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لوں گی'' جالب صاحب میڈم نور جہاں کے بنگلے پہنچ گئے اور اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ''ان انگلیوں سے میں نے ایک زبردست نظم کہی تھی'' اور پھر انہوں نے میڈم کے ہاتھوں میں اپنا کمزور اور نحیف ہاتھ دے کر یہ زوردار نظم پڑھی۔

ظلمت کو ضیاء صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو گہر دیوار کو در کرگس کو ہما کیا لکھنا
اک حشر بپا ہے گھر گھر میں، دم گھٹتا ہے گنبدِ بے در میں
اک شخص کے ہاتھوں مدت سے، رسوا ہے وطن دنیا بھر میں
اے دیدہ ورو، اس ذلت کو قسمت کا لکھا کیا لکھنا

میڈم نے نہ صرف یہ نظم سنی بلکہ فوٹو گرافر کو بلا کر تصویر کھنچوائی جس میں انہوں نے جالب صاحب کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔ تصویر انہوں نے جالب کے حوالے کی اور کہا کہ بے شک اخباروں میں یہ تصویر چھپوا دو، میں کسی جرنیل سے نہیں ڈرتی۔ جالب صاحب نے یہ تصویر سنبھالے رکھی جنرل ضیاء الحق کی موت کے کئی سال بعد اپنی آپ بیتی میں شامل کی۔ اب نہ ظلمت کو ضیاء اور بندے کو خدا لکھنے سے انکار کرنے والا شاعر باقی ہے اور نہ اس کی عزت افزائی کرنے والی سرکش ملکہ ترنم نور جہاں ہے۔ صرف یادیں رہ گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے (آمین)

عہدِ جالب کی گواہیاں (اقتباسات)

(زندگی میں)

(1) (48) ''جالب تم نے بڑی استقامت دکھائی۔''

(جوش)

(2) (49) دلی دکنی سے لیکر آج تک اتنے سامع کسی شاعر کو نصیب نہ ہوئے۔حبیب جالب اردو زبان کا عوامی شاعر ہے۔''

(فیض احمد فیض)

(3) (46) ''اردو زبان نے نظیر اکبر آبادی کے بعد اگر سچ مچ کوئی عوامی شاعر پیدا کیا ہے تو وہ حبیب جالب ہے۔نظیر اکبر آبادی کی طرح وہ بھی عوامی انسان ہیں ان کا رہن سہن عوامی ہے۔ ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز عوامی ہے۔ان کی قدریں عوامی ہیں، ان کی محبتیں اور نفرتیں عوامی ہیں اور وہ عوام کے دکھ درد، آرزوں اور امنگوں کی ترجمانی، عوام ہی کی زبان میں کرتے ہیں۔ یہ جو ہزاروں لاکھوں انسان حبیب جالب سے اتنا پیار کرتے ہیں اور ان کے اشعار سن کر فرطِ جذبات سے بے قابو ہو جاتے ہیں تو ان کا پیار ان کی وارفتگی بے سبب نہیں ہے۔''

(سید سبط حسن، 1978)

(4) (47) ''سورداس کا نغمہ اور میرا بائی کا سوز یکجا ہو جائیں تو حبیب جالب بنتا ہے۔''

(فراق)

(5) (50) ''بے شک علامہ اقبال اور ان کے بعد متعدد ترقی پسند شعرا، غزل کو عصری حقائق کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں قابلِ قدر کام کر چکے تھے اور غزل کو قدیم دور کے معیّن موضوعات کے حبس سے نکالنے کے لیے زمین ہموار کر چکے تھے مگر جب کوئی کاشت کرنے والا ہی نہ ہو تو ہموار زمینیں بھی ویرانوں میں بدل جاتی ہیں اس دور میں صرف جالب ہی ایک شاعر ہے، جس نے چھپ چھپا کر نہیں بلکہ دن کی روشنی میں اور ساری دنیا کے سامنے ان ممنوعہ زمینوں کا رخ کیا اور ان میں حق و صداقت اور جرأت و حوصلہ کی ایسی فصلیں کاشت کیں کہ خود اُس کے حصے میں تو قید و بند کی صعوبتیں آئیں مگر اس نے آنے والی نسلوں کے لیے سچ بولنا آسان بنا دیا۔''

(احمد ندیم قاسمی .1978)

(6)(51) ''حبیب جالب سے میری پہلی ملاقات عجیب حالات میں ہوئی، یہ غالباً 1962-63 کا واقعہ ہے۔ میں اور مولانا صلاح الدین احمد دفتر ''ادبی دنیا'' کی سیڑھیاں اتر کر شاہراہِ قائداعظم کے فٹ پاتھ پر پہنچے ہی تھے کہ ہماری نظریں ایک ایسے پریشان حال شخص پر پڑیں جو بڑے کرب سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ''وہ ہمارے بچوں پر لاٹھیاں برسا رہے ہیں، لاٹھیاں برسا رہے ہیں، بچوں پر لاٹھیاں برسا رہے ہیں'' ساتھ ساتھ خود اس کی آنکھیں بھی آنسو برسا رہی تھیں اور وہ شخص ان آنسوؤں کو پونچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا جو اس کی آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر اس کی بڑھی ہوئی داڑھی کو بھگوتے ہوئے اس کے ہونٹوں میں جذب ہو رہے تھے۔ مولانا نے اس شخص کو دیکھ کر فقط اتنا کہا ''یہ حبیب جالب ہے'' پھر کسی نے جیسے سرگوشی میں کہا ''بڑے ڈاک خانے کے قریب پولیس اور طلباء میں تصادم ہو گیا ہے۔''

(ڈاکٹر وزیر آغا .1978)

(7) (52) ''حبیب جالب نظریئے کا شاعر ہے، اس لیے کہ وہ نظریئے کا انسان ہے۔ زندگی کی قدریں اسے بے حد عزیز ہیں وہ بے قاعدگی، ظلم، ناانصافی، تعیش پسندی، اخلاقی پستی، سماجی ناہمواری کا دشمن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے سفر میں ہر اس شخص کے ساتھ ہو جاتا ہے جو ان قدروں کو ساتھ لے کر چلتا ہے، لیکن جہاں ان قدروں سے اس کا دامن چھوٹتا ہے۔ حبیب جالب

اس سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے اور اپنے فکر وفن کے نشتروں سے اس کو اُدھیڑ کے رکھ دیتا ہے۔"

(**ڈاکٹر عبادت بریلوی**۔1878)

(8) (53) "آج کا حبیب جالب سیاسی اور سماجی حالات کو شاعری بناتے ہوئے فکرو احساس کی باریکیوں کو منتقل کرنے میں بھی کامیاب ہو چکا ہے۔"

(**ڈاکٹر وحید قریشی**۔1978)

(9) (54) "اردو شاعری کی تاریخ میں نظیر اکبر آبادی کے بعد حبیب جالب دوسرا عوامی شاعر ہے۔ وہ عوام کی بات کرتا ہے، عوام کی زبان میں بات کرتا ہے، عوام کے مسائل پر بات کرتا ہے اسی لیے عوام اسے اپنا شاعر سمجھتے ہیں، اس سے پیار کرتے ہیں، اس کے گرویدہ ہیں اسے سن کر سر دھنتے ہیں۔ اس کے نغمے زباں زدِ عام ہیں اور وہ انہیں خلوت وجلوت میں لوک گیتوں کی طرح گنگناتے ہیں۔"

(**فارغ بخاری**۔1978)

(10) (55) "ہمارے یہاں شاعر دو ہی راستوں سے ادب کی اقلیم میں داخل ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ ادبی رسائل کے راستے یا مشاعرے کے راستے حبیب جالب تیسرے راستے سے آئے۔ قومی سیاست کے راستے۔ میں نے پوچھا کہ "حضرت مروجہ دو راستوں میں کیا قباحت تھی" جواب دیا "جتھے بندیوں نے وہ دونوں راستے مجھ پر بند کر دیے تھے" اصل میں حبیب جالب اردو شاعری میں اپنی نوع کا دوسرا واقعہ ہے۔ ان سے پہلے بڑا واقعہ نظیر اکبر آبادی کی صورت گزر چکا ہے۔ اس زمانے کے ثقہ شاعروں اور تذکرہ نگاروں نے نظیر کو میلوں ٹھیلوں اور گلی کوچوں میں نظم سناتے دیکھا اور اسے مبتذل شاعری کہہ کر رد کر دیا تھا۔ حبیب جالب کی شاعری پر بھی آج کل کے ثقہ ادیبوں نے کم ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی مگر ہوا یوں کہ نظیر کی شاعری کو میلوں ٹھیلوں میں پر لگے تھے حبیب جالب کی شاعری کو سیاسی جلسوں میں پر لگے ان کی شاعری کو پہلے قبول عام حاصل ہوا اور پھر خواص نے چار و ناچار انہیں قبول کیا۔"

(**انتظار حسین**۔1978)

(11)(56)''جالب اس گئے گزرے زمانے میں عشق اور جنوں کا مظہر ہے کیونکہ شاعری تو بہت لوگ کرتے ہیں اور شعروادب کی وادی میں پچاس سے بھی زیادہ برس گزار دیتے ہیں لیکن نہ ان کا دامن تار تار ہوتا ہے نہ ان کے پاؤں لہولہان ہوتے ہیں اور تو اور ان کا تو گریباں بھی چاک نہیں ہوتا۔ اس لیے جب گریباں چاک جالب کے لیے عقیدت کا نذرانہ لے کر بڑی بوڑھی، جوان رعنا اور مہ وشیں سبھی قطار اندر قطار آتے ہیں تو یہ تہی دامن جالب سے ہی صرف اظہارِ عقیدت ومحبت نہیں بلکہ یہ عقیدت ومحبت جالب کے آدرشوں کے لیے بھی ہے۔''

(عبداللہ ملک۔ 1978)

(12)(57)''اپنا کلام ترنم سے پڑھتے تھے اور فی الواقع حضرت کو لحنِ داؤدی عطا ہوا تھا جس سے بشر تو بشر، درو دیوار تک مست ہو جاتے تھے۔ مزید طائر بلند پرواز کی کیا مجال کہ ان کی نغمہ سرائی سنے اور پر مار سکے۔ آپ کو اپنی حق گوئی کی بناء پر قفس و زنداں کی مصیبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ سلطانِ معظم ایوب خان کے عہد میں ایک بار لوہاری دروازے کے باہر آپ کہیں جاتے تھے کہ دھر لیے گئے کوتوالِ شہر نے فردِ جرم یہ موزوں کی کہ حضرت کرتے تلے اور نیفے میں ایک دستی بم، دو طمنچے، دو رائفلیں اور ایک مشین گن لیے پھر رہے تھے۔''

(محمد خالد اختر۔ خاص لھجے میں لکھے گئے مضمون سے اقتباس۔1978)

(13)(58)''جالب کی تخلیقی شادابی میں کسی زمانے میں بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس نے جن بنیادی اصولوں پر ابتداء میں صاد کیا وہ آج بھی اس کا جزوِ ایمان ہیں اور ان کا بے باکانہ اظہار اس کی زندگی کا اولین مقصد۔''

(محسن احسان۔1978)

(14)(59)''اس نے خود کو مشاعروں کی گھٹی فضا سے باہر نکالا اور سیاسی جلسوں میں تاحدِ نگاہ پھیلے عوام سے براہِ راست ان کی زبان میں خطاب کیا۔''

(ڈاکٹر سلیم اختر۔1978)

(15)(60)''پاکستان کے گزشتہ تیس برسوں میں جن شاعروں نے اپنے سماجی تجزیے کو

مستقل طور پر مربوط اور بیدار رکھا ہے ان میں حبیب جالب سرفہرست ہے۔ ''تاؤیوان منگ'' کی طرح اس نے حقیقی جذبات وافکار کی شاعری کر کے اس ملک کے تہذیبی وجود کے تجزیے کو محفوظ کیا ہے۔ اس نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی زندگی کے انحطاط کو اپنے شعری منظر پر بے نقاب کیا ہے۔''

(ڈاکٹر تبسم کاشمیری.1978)

(16) (61) ''حبیب جالب نہ صرف شاعر کے انقلابی کردار کو قبول کرتے ہیں بلکہ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ شاعر معاشرے کی تعمیر، تشکیل اور تخلیق کا ذمہ دار بھی ہے۔ بلاشبہ ایک شاعر کی حیثیت میں اس کے ذمے یہ فرض ہے کہ وہ زندگی اور حسن میں نیا توازن پیدا کرے تاہم ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت میں وہ اس توازن کا امین بھی ہے چنانچہ حبیب جالب کی ایک منفرد عطا یہ ہے کہ انہوں نے موخر الذکر فریضہ سرانجام دینے کے لیے جبری خاموشی کی فضائے بسیط میں احتجاج کی پہلی پرزور آواز بلند کی۔''

(ڈاکٹر انور سدید.1978)

(17) (62) ''میں حبیب جالب کی شاعری کو کسی بھی شعری نظریئے کے سانچے میں کسنے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ اس کا مخاطب پوری دنیا میں پھیلا ہے۔ شاعری کیا ہے؟ مسئلہ اس نقاد کا ہے جو اس سوال کا جواب ابھی تلاش کر رہا ہے۔ زندگی کیا ہے؟ مجھے پتہ ہے زندگی کیا ہے اور اسی حوالے سے میں جانتا ہوں۔ شاعری کیا ہے؟ اور حبیب جالب کو میں نے مختلف شعری نظریات سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا پابلو نرودا نے رابرٹ بلی کو ایک انٹرویو میں بتایا تھا:

''میں ایک ایسے ملک سے آیا ہوں، جو بہت سیاسی نوعیت کا حامل ہے، جو لوگ وہاں لڑ رہے ہیں انہیں عوام کی حمایت حاصل ہے ہم لکھنے والے عوام کی حمایت کو محسوس کرتے ہیں اور ہمارا ادب عوام کو سمجھ میں آتا ہے میں اپنی نظمیں ملک کے ہر حصے میں پڑھتا ہوں ہر گاؤں میں ہر قصبے میں سالہا سال سے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ میرا فرض ہے اس لیے میں لوگوں میں جا کر شاعری پڑھنے سے بہت حوصلہ حاصل کرتا ہوں۔ مجھے لوگوں میں جا کر شاعری پڑھنے کی اہمیت کا

احساس ہے کیونکہ آئے دن میرے اس عمل کے خلاف اخبارات میں لکھا جاتا ہے جو میری شاعری کو اس روایت میں لانا چاہتے ہیں جو سکول، یونیورسٹی، اکیڈمی اور تبصروں کی راویت ہے'' لیکن اگر ''لوگ'' مجھ سے میری شاعری کی کوالٹی بڑھانے کا مطالبہ کریں گے تو میں اپنی شاعری کا معیار بڑھانے کی طرف توجہ دوں گا۔''

(**اصغر نحیم سید**۔1978)

(18)(63)''منصور حلاج نے ایک ہی نعرے سے سارے معاشرے کے ضمیر کو دُھن کر رکھ دیا اس نے کہا ''اصل طواف تو کعبہ دل کا ہے'' تو سلطنت عباسیہ پر جو حرمین شریف کی محافظ بنی بیٹھی تھی پر رعشہ طاری ہو گیا۔ اس نے کہا مجھے مار ڈالو کہ میری اور میرے خالق کی روح ایک ہے اور یوں مل چکی ہے جیسے مشک اور عنبر ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ خلیفہء وقت اور اس کے وزیروں نے یہ فیصلہ دیا کہ اس احتجاج کی آواز کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جائے۔ درباری فقیہہ اور سب نے سر جھکا دیے اور منصور حلاج سورۃ شوریٰ کی یہ آیت پڑھتا ہوا ان ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے وہ عذاب ان پر اس وقت آئے گا جب وہ اپنے کیے کے انجام سے ڈر رہے ہوں'' آخری سانس کے ساتھ وہی ایک صدا نکلی ''انا الحق'' اور منصور ہمیشہ کے لیے سربلند ہو گیا اور احتجاج کی آواز زمان و مکان کی ہر قید سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئی۔ وہ نیلسن منڈیلا ہو یا یاسر عرفات، سب منصور حلاج کی سنت پر عمل کر رہے ہیں۔ سب کا ایک ہی ایمان ہے کہ ظالم کا انجام بالآخر دردناک عذاب ہے۔ اردو شاعری میں احتجاج کی تحریک نظیر اکبر آبادی سے حسرت موہانی اور ظفر علی خان تک پہنچی اقبال کے کلام میں اس آواز میں ایک عظمت پیدا ہوئی اور فیض نے اسے ایک عمومی رنگ دیا۔ آج حبیب جالب کے شعر میں منصور حلاج کی آواز گونجتی ہے۔''

(**الطاف گوہر** .1986)

(19)(64)''پاکستان میں عوامی بیداری کی جو لہر چلی اس کے نغمہ خوانوں میں حبیب جالب سب سے آگے ہیں۔ انہوں نے پولیس کی لاٹھیاں کھائیں، قید خانے دیکھے، ان کا مجموعہ بھی بحق سرکار ضبط ہوا، یہ الگ بات کہ ان کی پوری کتاب لوگوں کو زبانی یاد ہے۔ حبیب جالب کی

اپنی سیاسی پارٹی کا نام ''عوام'' ہے اور وہ ہر اس پارٹی کے ساتھ ہیں جو عوام کے مسائل کو سمجھتی ہے اور اسے عوام کے حوالے سے دور کرنا چاہتی ہے۔''

(**احمد بشیر**۔1965)

(20)(65) ''جب پاکستانی خواتین نے اپنے حقوق کی پامالی کے خلاف لاہور میں احتجاجی جلوس نکالا تھا اس جلوس میں مائیں، بہنیں، بیٹیاں سبھی شامل تھیں اور ''جواں مرد'' ان پر دھڑا دھڑ لاٹھیاں برسا رہے تھے اور عورتوں کے ساتھ لاٹھیاں کھانے والوں میں ایک کمزور دل حبیب جالب بھی شامل تھے۔ حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں لیکن ہر حکومت کا حبیب جالب کے ساتھ سلوک یکساں رہتا ہے۔ حکومتوں کے منظر بدل جاتے ہیں جالب کا منظر نہیں بدلتا۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ آخر ہم سب جالب کو کس طرح یاد رکھیں گے۔ کس طرح اس جرأت کا صلہ دے سکیں گے کس طرح اس احسان کا بدلہ اتار سکیں گے تو میرے ذہن میں ہلکے ہلکے دو ایک تصویریں ابھرتی ہیں مگر ایک زیادہ واضح اور خوبصورت ہے، شاید ایک عورت کی آنکھیں ہی یہ منظر دیکھ سکتی ہیں۔ کچھ اس طرح کہ ہوسکتا ہے ''اس احتجاجی جلوس میں کسی نوعمر لڑکی پر برسنے والی لاٹھی کو جالب نے اپنے ہاتھوں پر روک لیا ہو، برسہا برس بعد وہ لڑکی اپنے بچوں کو ایک کہانی سنائے اور کہے کہ ''سنو! یہ کہانی نہ کسی بادشاہ کی ہے، نہ وزیر کی، نہ کسی جنگ جیتنے والے کی نہ ہارنے والے کی۔۔۔ یہ کہانی ایک سیدھے سادے انسان کی کہانی ہے جس نے ظلم و جبر کا مقابلہ کرتے وقت۔۔۔ میری مدد کی تھی وہ ایک شاعر تھا اور اس کا نام حبیب جالب۔۔۔ مجھے یہ نام آج بھی یاد ہے اور میرے بچو! تم بھی اس نام کو یاد رکھنا۔''

(**زہرہ نگاہ**۔1986)

(لندن میں جالب کے اعزاز میں ہونے والی تقریب میں صدارتی خطاب، سے اقتباس)

(21)(66) ''جالب کی ماں نے اسے جنم دیتے ہوئے بھلا کب یہ خیال کیا ہوگا کہ اس کا بیٹا محلے اور بستی کی لڑکیوں کے عشق میں گرفتار ہو، سو ہو، عشق بشر میں یوں گھرے گا کہ پھر پایا نہ جائے گا۔ درد سے تڑپتے ہوئے اسے گمان بھی نہیں ہوگا کہ جس کا نام وہ حبیب رکھے گی وہ اپنے نام کی تصویر بن جائے گا۔ اسے بے نواء اور درماندہ انسانوں کی دوستی اور رفاقت یوں راس آئے

گی کہ پھر وہ ان ہی کا یار بیلی، سنگی ساتھی رہے گا۔ آخری سانس تک کرب تخلیق سے تڑپے گا اور اس کا سینہ اپنے لوگوں کے غم میں تڑپے گا لوگ اسے دیوانہ کہیں گے اور وہ دیوانہ کہنے والوں کے بارے میں لکھے گا۔

جسے ملیے ہمیں اس شہر میں دیوانہ کہتا ہے
نہ جانے، کیا خرابی ہے، مری جاں ، عشقِ انساں میں

(زاھد حنا۔1985)

(22)(67)''حبیب جالب سے انٹرویو کرنا مشکل ہے اس کی شخصیت اس کی شاعری بجائے خود ہر سوال کا دوٹوک جواب ہے۔ اس لیے اس سے بات کرنے کے لیے کسی سوالنامے کی ضرورت نہیں۔''

(احمد سلیم۔1984)

(23)(68)''حبیب جالب عام لوگوں کا شاعر ہے۔ وہ خلقِ خدا سے براہ راست مکالمہ کرتا ہے۔ بہت سہل اور سادہ مگر انتہائی موثر لب و لہجے میں۔ یہی سبب ہے کہ اپنے اثر و نفوذ اور عوامی مقبولیت کے باعث جالب کی شاعری عصری آوازوں میں نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے۔ جالب کے نغمے مزدوروں میں اور کسانوں میں طالب علموں میں، دکانداروں میں، زندگی کے سب شعبوں میں ستائے ہوئے لوگوں میں شہروں شہروں، قریوں قریوں، گلیوں گلیوں میں اپنا جادو جگاتے ہیں۔ جالب کی زندگی اور شاعری اپنے مقصد پر اس کے مکمل اعتماد کی آئینہ دار ہیں۔ عوام سے وابستگی اس کا عقیدہ اور اس سے منسلک رہنا اس کا مقصدِ حیات ہے۔''

(ھمایوں گوھر۔1986)

(24)(69)''میں اپنے دورِ حکومت میں صرف ایک شخص سے عاجز آیا اور وہ تھا حبیب جالب، اگر اس کی زمین ہوتی تو میں چھین لیتا، جائیداد ہوتی تو ضبط کر لیتا، کھیت ہوتے تو جلا ڈالتا، سرمایہ ہوتا تو تگنی کا ناچ نچا دیتا، مگر اس کے پاس شاعری تھی اور شاعر کا ضمیر جس کا میں کچھ نہ بگاڑ سکا۔''

(نواب امیر محمد خان آف کالا باغ، سابق گورنر مغربی پاکستان)

(25)(70)''میری حکومت گرانے میں 60 فیصد حصہ مادرِ ملت کا ہے اور 40 فیصد حبیب جالب کا، میں حبیب جالب سے وہ تمام شاعری سننا چاہتا ہوں جو اس نے میرے دورِ حکومت کے خلاف کی ہے، میں ان کی خدمت بھی کروں گا۔''

(جنرل محمد ایوب خان)

(26)(71)''جواں سال شاعر حبیب جالب جو بڑی تیزی سے اپنے ہم عصر شعراء کی صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔''

(شورش کاشمیری)

(27)(72)''حبیب جالب! میں تم سے مل کر خوش ہوا، اس وقت میرے پاس یہ کمبل ہے اسے قبول کرو۔''

(خان عبدالغفار خان (باچا خان)

(28)(73)''ہم نہیں جانتے کہ آپ کتنے بڑے شاعر ہیں مگر ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ آپ بہادر شاعر ہیں۔''

(حسین شہید سہروردی)

لو اب تو شورِ نالہ و فریاد تھم گیا
میرے جنوں پہ ایک زمانے کی تھی نظر

(جالب)

(بعد از مرگ۔ تاثرات)

''حبیب جالب بلاشبہ اپنے عہد کا نمایاں اور نمائندہ شاعر تھا۔''

(احمد ندیم قاسمی)

''مجھے جالب کی موت پر یقین نہیں آ رہا۔ یقیں آ بھی نہیں سکتا۔ جالب کبھی نہیں مر سکتا۔ بس وہ خاموش ہو گیا ہے، مگر اس کی باتیں زندہ ہیں۔ اس کا کلام تازہ ہے۔ اس کی سوچ زندہ ہے۔ اس نے بڑے بڑے آمروں، جابروں کو للکارا۔ اس کی آواز، کو للکار کو، دنیا بھر کا ستم نہ دبا سکا۔ اس کی آواز فضا میں گونج رہی ہے۔ گونجتی رہے گی۔ جب تک آمریت اور جبر کا وجود ہے حبیب جالب کی شاعری دلوں کو گرماتی رہے گی۔ وہ ذہنوں میں دلوں میں بستا ہے۔ وہ میرا دوست تھا، بھائی تھا۔ میں اس کے چلے جانے پر بہت دکھی ہوں، مگر محض دکھی ہونے سے ہی بات نہیں بنے گی۔ ہمیں اس کی سوچ کو زندہ رکھنا ہے، آگے بڑھانا ہے۔''

(احمد فراز)

''حبیب جالب ایک شاعر ہی نہیں تھا وہ ایسا انسٹی ٹیوشن تھا جو اس کی ذات پر مشتمل تھا جالب نے جس بے باکی سے اپنے گرد و پیش پر تنقید کی اسکی مثال کہیں نہیں ملتی۔ لوگوں نے فیشن کے طور پر جو مزاحمتی شاعری کی جالب نے اسے مشن بنائے رکھا۔''

(قتیل شفائی)

"حبیب جالب میرے ہم وطن تھے جہاں سے ہم نے ہجرت کی تھی۔ یعنی ہوشیار پور۔ یہاں بھی ہم اکٹھے رہے وہ بہت بڑے اور خاص طرز کے شاعر تھے۔ خداوند کریم انہیں رسول کریم کے وسیلے سے بہشت نصیب کرے۔"

(منیر نیازی)

"جالب کی ہر نظم مشاعرے کے اختتام پر ترانے کی شکل اختیار کرتی گئی۔ انہیں بھلایا نہ جا سکے گا۔"

(زہرہ نگاہ)

"وہ میٹرک پاس بھی نہ تھے۔ آخر ایک نہیں کئی کئی یونیورسٹیوں کا کام کر گئے۔ میں انہیں سوبورن یونیورسٹی (پیرس) کی انقلابی روح کہا کرتا تھا۔ ان کی غزلیں بھی بڑا مقام رکھتی ہیں مگر ان کا احتجاجی کلام پاکستانی تاریخ ادب میں اعلیٰ ترین جگہ لے چکا ہے۔"

(جمیل الدین عالی)

"وہ حبیب جالب جو نام ہے ایک اصول کا، ایک نظریئے کا اور ایک خاص فکر کا وہ زندہ ہے اور زندہ رہیگا۔ اس حبیب جالب کو موت نہیں آئے گی۔ نہیں آ سکتی۔

(مرزا ادیب)

"ہمارا جالب سچ مچ کا عوامی شاعر ہے۔"

(پروفیسر کرار حسین)

"حصول آزادی کے بعد برصغیر کی کسی زبان میں بھی حبیب جالب جیسا نڈر اور باضمیر شاعر پیدا نہیں ہوا۔"

(نندکشور و کرم۔ مدیر عالمی اردو ادب دھلی

"جانا تو سبھی کو ہے، مگر حبیب جالب کے جانے کو لوگ بہت محسوس کریں گے۔ میرا بہت اچھا دوست چلا گیا ہے۔"

(احمد راہی)

"حبیب جالب نابینا قوم کے بینا شاعر تھے۔"

(افضل توصیف)

"حبیب جالب اپنا حق ادا کر گیا۔ اسے لوگ یاد کریں گے۔"

(کشور ناہید)

"حبیب جالب کبھی ختم نہیں ہوگا کیونکہ حبیب جالب جیسا مزاحمتی کردار ہر عہد میں پیدا ہوتا رہے گا۔"

(وارث میر)

"والٹر کے مقولے "جب بھی میں قلم اٹھاتا ہوں تو حالتِ جنگ میں ہوتا ہوں۔ جالب اس مقولے کی مجسم تصویر تھے۔ بلاشبہ وہ ایک بڑے جنگجو شاعر تھے۔"

(صفدر میر)

"حبیب جالب بھی چلے گئے پاکستان اجڑتا جا رہا ہے وہ اپنی طرز کا واحد شاعر تھا۔ مولانا ظفر علی خان کی روایت میں مولانا کے بعد اس طریقے کا اس سے پہلے کوئی تھا نہ اب ہے۔ عوام نے حبیب جالب سے اتنی محبت کی کہ اس عہد میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔"

(شہرت بخاری)

"ایسی ہی شخصیتوں کی وجہ سے جینے کی ہمت ہوتی ہے۔ پیارے"

(سلیمہ ہاشمی)

"خدا نے انہیں مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت دی تھی۔"

(نثار عثمانی)

"ہم ترقی پسند کہلاتے ہیں مگر وہ ہم سب میں منفرد تھا۔ ہم میں دور دور تک کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دے رہا جو ملک کے صدر اور وزیر اعظم کو منہ پر کہے کہ "تم غلطی پر ہو۔" وہ پاکستان کا ضمیر تھا۔ جو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ہے۔"

(صدیقہ بیگم)

"جالب بہت بڑے شاعر، بڑے انسان تو تھے ہی ہمارے ذاتی دوست بھی تھے۔ ہمارا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔"

(عابد حسن منٹو)

”موجودہ دور کے شعراء کو آنے والی نسلوں کے سامنے نادم ہونے سے اگر کوئی شاعر بچائے گا تو وہ حبیب جالب ہوگا۔“

(افتخار عارف)

”حبیب جالب ایک عہد تھا جو اپنے نقش چھوڑ کر ہم سے جدا ہوا۔ انہوں نے ایک روشن باب رقم کیا ہے، جو آنے والوں کو راہ دکھائے گا۔“

(فخر زمان)

”حبیب جالب کے جانے پر ہم سب دکھی ہیں۔ وہ بہادروں کی طرح جیا اور دوسروں کو جینے کا فن سکھلا گیا۔ اس جیسے لوگ بہت کم آیا کرتے ہیں۔“

(اظہر جاوید)

”جالب بہت باہمت اور انتھک عوامی شاعر تھے۔ منافقت اور منافقانہ رویوں اور ناہمواریوں کے خلاف حق بات کہنے والوں کا تسلسل حبیب جالب کی پیاری ذات تھی۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے اور انہیں ابوذر غفاریؓ جیسے عظیم انسان دوستوں کے ساتھ محشر میں سرخرو کرے۔“ (آمین)

(سید افضل حیدر)

”ایک عظیم اور صاحبِ کردار نظریاتی شخص اور شاعر ہم سے جدا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں ان کی قربانیوں کا ثمر عطا فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔“

(عطاء الحق قاسمی)

”موت بھی حبیب جالب کا انتظار کرتی رہی زندگی بھی اس کی منتظر رہی۔ مگر اس نے دونوں کی پرواہ نہ کی۔ وہ ہمارے زمانے کا منفرد ترین انسان تھا۔“

(ڈاکٹر اجمل نیازی)

”جس طرح ”لورکا“ چاہتا تھا کہ مرنے کے بعد بھی اس کی کھڑکی کھلی رہے تاکہ وہ بچوں کو گلی میں ناشپاتیاں کھاتے ہوئے دیکھتا رہے۔ اسی طرح جالب اپنی آخری سانسوں تک ایک خوش حال نسل کا منتظر رہا۔“

(زاھد فخری)

''قومیں حبیب جالب جیسے بے باک اور انسانیت سے محبت کرنے والوں کے معتبر ناموں سے ہی پہچانی جاتی ہیں۔''

(یاسمین حمید)

''حبیب جالب سب سے بڑا عوامی اور سیاسی شاعر تھا۔ ان کے بعد یہ خلا کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔''

(افضل احسن رندھاوا)

''حبیب جالب مجھے بُرا لگتا ہے کہ وہ مجھ سے بڑا آدمی تھا۔ بہت بڑا آدمی، مجھ سے بڑا کہ میں اس کے سامنے بونا لگتا تھا۔''

(مُنو بھائی)

''میرے خیال میں پاکستان کی سیاسی روح کھینچ لی گئی ہے۔ جب جالب خود ہی سو گیا تو کون جاگے گا اور کون جگائے گا۔''

(اعتزاز احسن)

''حبیب جالب اپنے عہد کا ضمیر بن چکے تھے۔''

(ڈاکٹر سہیل احمد خان)

''جالب جس عہد میں زندہ رہا۔ اپنی ساری سوچوں کا سارا رزق، اپنے گردوپیش بہنے والے آنسوؤں سے کشید کرتا رہا۔''

(طارق عزیز)

''لوگ آمروں سے ڈرتے ہیں۔ آمر حبیب جالب سے ڈرتے تھے۔''

(پروفیسر غفور احمد)

''جس طرح شاعری میں جالب کا لہجہ منفرد تھا۔ اسی طرح اندازِ گفتگو بھی قطعی مختلف تھا۔ استعجابی، معصومانہ، سیدھا لیکن براہ راست۔''

(شفیع ادیب)

''حبیب جالب کی شاعری کے بارے میں کوئی دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ وہ ایسا شاعر تھا جس کا کلام لاکھوں کروڑوں عوام کے دلوں کی پکار بن کر ابھرا اور اس کے کلام سے ہر عہد کے حکمران خائف رہے۔''

(خالد کاشمیری)

''سنگینوں کے ہر عہد میں سچ کہنا، لکھنا حبیب جالب کی زندگی کا شعار بن گیا تھا۔ ''اظہارِ حق'' اور حبیب جالب ایک ہی شے کے دو نام تھے۔''

(محمد فاروق قریشی)

''جالب جیسے لوگ روز پیدا نہیں ہوتے۔ ان کی شاعری ظلم اور ناانصافی کے خلاف لڑنے والوں کے لیے امید کی کرن ہے اور ان کی ذات جرأت، بہادری، اصولوں پر کامل یقین اور ثابت قدمی کی ایک روشن مثال ہے۔''

(پروفیسر خالد محمود)

''لاریب کہ تم سچے تھے، ہم تمہاری مثال نہیں دے سکتے کوئی نظیر نہیں لا سکتے۔''

(زاھد ضا)

''حبیب جالب نے ایک باپ کی طرح مجھے نصیحت کی تھی ''بیٹا ہمیشہ سچ بولنا۔''

(حامد میر)

''حبیب جالب کی شاعری ان اجتماعی آدرشوں اور امنگوں کی آئینہ دار ہے جو ایک حساس ذہن اس معاشرے کے بوسیدہ ڈھانچے کو روح اور تازگی دینے کے لیے تصور کر سکتا ہے۔''

(عارف چودھری)

''حبیب جالب کی وفات قومی سانحہ ہے۔''

(نوابزادہ نصر اللہ خان)

''حبیب جالب کی شاعری اور جدوجہد، عوام کی جدوجہد سے مربوط تھی، ان کی وفات پاکستان کی سیاسی اور عوامی جدوجہد سمیت اردو ادب کا عظیم نقصان ہے۔''

(محترمہ بے نظیر بھٹو)

''حبیب جالب کی وفات رمضان المبارک کے مقدس مہینہ میں جمعہ کی رات ہوئی، اور ان مقدس ایام میں صرف اللہ کے محبوب بندے ہی آخری سفر اختیار کرتے ہیں۔''

(مولانا شاہ احمد نورانی)

''حبیب جالب نے پاکستان میں آزادیء اظہار کے لیے زبردست جدوجہد کی۔ جمہوریت کی بحالی اور استحکام کے لیے ان کی قربانیاں نا قابلِ فراموش ہیں۔''

(قاضی حسین احمد)

''حبیب جالب نے پوری زندگی آمریت کے خلاف اپنی بے مثال اور جرأت مند شاعری کے ذریعہ جدوجہد کی۔''

(علامہ ساجد علی نقوی)

''حبیب جالب نے اپنی شاعری کے ذریعے دکھی اور مظلوم انسانیت کی جو خدمت سرانجام دی ہے وہ قیامت تک یادرہے گی۔''

(بیگم نصرت بھٹو)

''حبیب جالب بہت بڑے اور غیرت مند شاعر تھے۔''

(نوازشریف)

''شاعرِ انقلاب حبیب جالب کی موت نہ صرف پاکستان کے عوام، بلکہ دنیا بھر کے مظلوموں کا عظیم نقصان ہے۔''

(ائیرمارشل اصغر خان)

''حبیب جالب مظلوم طبقوں کے بے باک ترجمان تھے۔''

(بیگم نسیم ولی خان)

''پاکستان سمیت دنیا بھر کے عوام ایک سچے دوست سے محروم ہو گئے۔''

(مخدوم محمد امین فھیم)

''حبیب جالب ترقی پسند اور انسانیت نواز شاعر تھے۔''

(ایس. ایم. ظفر)

"ہمارے لیے حبیب جالب کی ذات بہادری اور ثابت قدمی کا بہترین نمونہ تھی۔"

(عاصمہ جہانگیر)

"حبیب جالب کی موت سے قوم ایک عظیم شاعر سے محروم ہوگئی۔ وہ میرے والد کے پرانے دوستوں میں سے ایک تھے۔ ان کی موت میرا ذاتی صدمہ ہے۔"

(خورشید محمود قصوری)

"وہ غریب سیاسی کارکنوں کی آبرو تھا۔ ایسے بہادر محبِ وطن صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔"

(اقبال احمد خان، جنرل سیکرٹری مسلم لیگ)

"جناب حبیب جالب کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔"

(سلمان تاثیر)

"حبیب جالب جیسے بیٹے مائیں روز روز پیدا نہیں کرتیں۔"

(شیخ رفیق احمد ایڈووکیٹ)

"حبیب جالب کے انتقال کی خبر نظر کے سامنے آئی تو دل کانپ کر رہ گیا اور دماغ یہ سوچنے لگا کہ اب غریب ستم زدہ اور مظلوموں کی آواز کون بلند کرے گا۔ اب غریبوں کو از خود جالب بننا ہوگا۔"

(عبدالغفار کاکا گوجر)

"جناب حبیب جالب عوام کے حقوق اور جمہوریت کے نقیب تھے۔"

(عارف اقبال بھٹی۔ ایڈووکیٹ)

"جناب حبیب جالب صاحب پاکستان کے چند عظیم ترین انسانوں میں سے ایک تھے۔ ان کا جذبہء قربانی وایثار ہم سب کے لیے مشعلِ راہ اور ہماری قوم کا اثاثہ ہے۔"

(حامد خان۔ ایڈووکیٹ)

"جناب حبیب جالب میرے زیرِ علاج کوئی پانچ سال رہے ہیں۔ میں نے ان کو مخلص انسان

اور عوامی شاعر پایا۔ لندن جاتے وقت میں نے انہیں کہا کہ آپ اپنے بیٹے کو ہمراہ لے جائیں تو انہوں نے فرمایا کہ "آپ میرے بیٹے نہیں!!!" اور میں نے ان کے ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔ وہ نڈر انسان اور مخلص دوست تھے، شاذ و نادر ہی ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں۔"

(ڈاکٹر محمد اقبال)

"پاکستان کی ایک عظیم شخصیت، جمہوری جدوجہد کا نڈر اور بے باک سپاہی حبیب جالب آج ہم سے جدا ہو گیا ہے۔ اس نے ساری عمر استبداد اور ظلم کے خلاف جدوجہد کی اور نہایت بے سروسامانی کے عالم میں بھی کبھی ضمیر فروشی نہیں کی۔"

(سردار شوکت علی)

"آمریت کا بت شکن شاعر مر گیا۔"

(زیڈ۔ اے۔ زیدی)

"ایک دیوانہ، فرزانوں کی محفل سے اٹھ گیا۔"

(لطیف بٹ۔ خاکسار)

"حبیب جالب شاعری کی ہی نہیں شاعروں کی بھی آبرو تھے۔"

(ڈاکٹر انور سدید)

"حبیب جالب کی موت ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔"

(غلام حیدر وائیں)

"حبیب جالب زرداروں کے خلاف موجودہ دور کے ابوذر تھے۔"

(معراج محمد خان)

"حبیب جالب سچ کی آواز تھے۔ مجھے فخر ہے کہ وہ میرے دوست تھے۔"

(ملک محمد قاسم)

"حبیب جالب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی رہی کہ تمام ادوار میں کہ جب ملک میں آمریت اور فوجی حکومتیں رہیں انہوں نے نہ تو خود ساختہ جلاوطنی اختیار کی اور نہ ہی خاموشی اختیار کی۔"

(ڈاکٹر مبارک علی)

"حبیب جالب نے عراق، ایران اور لیبیا کی حکومتوں کی طرف سے مالی امداد کی پیشکش قبول نہ کی۔ اور میں حکومت کی جانب سے 5 لاکھ روپے لے کر گیا تب بھی انہوں نے انکار کر دیا۔"

(چودھری شجاعت حسین)

"حبیب جالب ایک فوج کے سالار تھے، عوام کے شاعر تھے۔ جس جرأت سے وہ زندہ رہے، اسے ہمیں اپنی آئندہ نسلوں میں منتقل کرنا ہوگا۔"

(سوبھوگیان چندانی)

"ان کی کمی زندگی بھر محسوس ہوگی۔"

(محمد علی۔ اداکار)

"جالب کی شاعری اس عہد کا ورثہ ہے۔"

(سی۔ آر۔ اسلم)

"حبیب جالب کی شاعری آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔"

(ملک معراج خالد)

"حبیب جالب مظلوم طبقوں کے ترجمان تھے۔"

(غلام احمد بلور)

"حبیب جالب ایک نہایت زندہ دل انسان تھے۔"

(ملک حامد سرفراز۔ ایڈووکیٹ)

"حبیب جالب جیسا سچا انسان مر نہیں سکتا۔ ایسا بے باک انسان میری نظروں سے نہیں گزرا۔ ان کی شخصیت میں ان کا سچا اور کھرا لب و لہجہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔"

(مصطفیٰ قریشی۔ اداکار)

"گل پوش وادیوں کو چھوڑ کر زندگی کے خارزاروں میں زنجیر کی جھنکار پر رقص کناں حبیب جالب، جہاں بھی گیا داستاں چھوڑ آیا۔"

(شائق ہاشمی)

"حبیب جالب نے اصولوں پر کبھی سودے بازی نہیں کی اور اپنے قلم کے ذریعے عوام کے

حقوق کی جنگ لڑتے رہے۔"

(میر تاج محمد جمالی)

"کچلے ہوئے طبقات کے اندھیرے ذہنوں میں روشنی کے چراغ جلاتے رہے۔ان کے سکتہ زدہ اعصاب کو اپنے اشعار سے جھنجھوڑتے رہے۔سراپا خودداری وجود ان کا۔سچ کے پیروکار تھے۔حبیب جالب رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔وہ انکا کلام،ان کا پیام۔"

(اقبال ملک۔تبسم ملک۔خواجہ اکرم)

"حبیب جالب کی شاعری شکستہ دل کی صدا بھی ہے،اور سوزِ یقیں کی للکار بھی۔"

(ایف۔ڈی۔فاروقی)

"سچ ڈُب گیا اے۔ماتم کرو۔"

(شوکت علی۔گلوکار)

"پاکستان کے محنت کش حبیب جالب کی جدوجہد کو جاری رکھیں گے۔"

(غلام نبی کلو۔صدر پاکستان مزدور کسان پارٹی)

"حبیب جالب کی موت قوم کا بڑا نقصان ہے،ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔وہ بڑے انقلابی شاعر تھے،سیاسی دانشور اور بہادر انسان تھے۔"

(غلام مصطفی کھر)

"18 سال بعد ایک اور نعیم ہاشمی،نعیم ہاشمی کی طرح مرگیا"

خرد کی بزم سے اٹھ کر اگر گیا کوئی
فریب سود و زیاں سے گزر گیا کوئی

(خاور نعیم ہاشمی)

"حبیب جالب کی وفات سے اس ملک کے عوام بالعموم محنت کش اور غریب عوام اپنے محسنِ اعظم سے محروم ہو گئے۔"

(اصغر خادم۔ایڈووکیٹ)

"میری دعا ہے کہ خدا کالی کملی والے کے صدقے میں جالب بھائی کی قیامت کے دن

شفاعت فرماتے ہوئے مغفرت فرمائے۔" (آمین)

(سلطان راہی۔ اداکار)

"جالب سے میرا تعلق چالیس سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ درویش تو وہ تھا مگر نڈر، بہادر، ایسا جرأت مند شخص میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا، بس سنا ہے کہ ایک ایسا درویش حسرت موہانی ہو گزرا ہے۔"

(ڈاکٹر صلاح الدین اکبر)

"مجھے یقین ہے کہ مجبوروں، مقہوروں، ناداروں کے دکھوں کی رات جب بیتے گی اور خوشحالی اور آزادی کا سویرا ہوگا۔ تو جالب آسمان کی بلندیوں میں ہمیں مسکراتا نظر آئے گا۔"

(ڈاکٹر اعزاز نذیر)

"حبیب جالب ایک استحصال زدہ معاشرے میں مسلسل مزاحمت کا نام ہے اور ایسے مزاحمتی کردار ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔"

(عمران خان)

"حبیب جالب عوام، انقلاب اور جدوجہد پر یقین رکھنے والا انقلابی تھا۔"

(شوکت چودھری)

"حبیب جالب کی شاعری نے ذہنوں کو جو تازگی اور روشنی بخشی ہے وہ ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔"

(ڈاکٹر حنیف فوق)

"جب بادل چھٹ جائیں، پہاڑی چوٹیاں واضح دکھائی دیں، پاکستان اپنی جون میں واپس آجائے، فوج سے تعلق رکھنے والے آخری طالع آزما کا بھی جب سورج غروب ہو جائے، تب پارلیمنٹ چوک پر حبیب جالب کا، کانسی کا مجسمہ نصب کیا جائے اور اس پر ان کی "صبحِ بے نور" والی نظم لکھ دی جائے۔"

(ایاز امیر)

"اتنے ظلم و ستم سہنے والے شاعر سے کوئی آمر، کوئی حاکم اس کی معصومانہ رجابت نہ چھین سکا، اس نے اپنی نظم۔۔ "بچوں کے نام" میں کہا تھا "میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صورت"

حبیب جالب وعدے کے پکے تھے دیکھئے ان کا وعدہ کب ایفا ہوتا ہے۔"

(ڈاکٹر محمد علی صدیقی)

"جالب صاحب! کبھی آپ کہہ رہے ہیں "ایسے دستور کو صبحِ بے نور کو میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا کبھی آپ کہہ رہے ہیں "تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا، اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا" تو کبھی کہہ رہے ہیں "لاڑکانے چلو، ورنہ تھانے چلو" تو کبھی! "ظلمت کو ضیاء صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا" اور کبھی کہتے ہیں "ہر بلاول ہے دیس کا مقروض، پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے" بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہے! آپ کو تو مارا ہی جانا تھا۔"

(مجاهد بریلوی)

شعراء کرام کا خراجِ تحسین

شاعرِ عظمتِ جمہور حبیب جالب
زندگی کا ہے صحیفہ سرِ مقتل تیرا

(رئیس امروہوی)

ہے ہمیشہ سے یہی افسانۂ پست و بلند
حرفِ باطل زیبِ منبر، حرفِ حق بالائے دار

(علی سردار جعفری)

جالب وہ مزاحمت کا شاعر
ایوانِ ستم ہے، جس سے لرزاں

(ظیق ابراهیم ظیق)

ہو نہ ہو، یہ کوئی سچ بولنے والا ہے قتیل
جس کے ہاتھوں میں قلم پاؤں میں زنجیریں ہیں

(قتیل شفائی)

تم جالب ہو اور میں نصیر
ہم دونوں چاہِ زنداں میں پڑے ہوئے ہیں

آؤ دونوں مل کر نوکیلی اور چیختی ہوئی
گولیوں جیسے اشعار کی لڑیاں پروئیں

(گل خان نصیر(بلوچی نظم کا ترجمہ)

بسر ہو زندگی کیسے، اگر نہیں معلوم
تو پوچھ لیجیے، جاکر حبیب جالب سے

(افضل صدیقی)

حق بات بھی کہتا ہے، پھر ظلم بھی سہتا ہے
اور ملک میں رہتا ہے، مفرور نہیں ہوتا

(محسن بھوپالی)

تاریخ نے خلقت کو تو قاتل ہی دیے
خلقت نے دیا ہے اسے جالب سا جواب

(فہمیدہ ریاض)

تو شاعرِ جمہور ہے جالب مرے پیارے
تیری طرح بے ساختہ چاہے گا ہمیں کون

(نگہت بریلوی)

جالب کہ ہے اس عہد کی خوشبوئے صداقت
کیوں نام نہ لیں، اہلِ وطن اس کا ادب سے

(خالد حمیدی)

سنگ و سر چھاؤں کی طرح سے برستے ہی رہیں گے
یوں تو شانوں پہ ہیں، لیکن تہہ دستار نہیں ہیں

(خالد احمد)

نہیں کہ صرف گذشتہ عذاب تو نے سہے
کہ یہ گھڑی بھی ہے جالب تجھی پہ آئی ہوئی

(نجیب احمد)

سرنوں ینوا کر کے جینا چنگا نہیں
سب نوں گل سمجھا دے میرے جالب دی

(بابا نجمی)

ہم آشنا ہیں
تمہارے لفظوں کی خوشبوؤں سے
وہ خوشبوئیں جو
ہماری سانسوں میں پھول بن کر مہک رہی ہیں
کہ جیسے شیشم کی ڈالیوں پر محبتوں کی صداقتوں کی
حسین چڑیاں چہک رہی ہیں
ہم آشنا ہیں

(حسن رضوی)

شعراء کرام کا خراج عقیدت

قولِ حق پیش حکم جابر
یہ سعادت ہوئی تھی اس کو نصیب
مردِ بیباک، پاک جادو لب
جالبِ خوش نواء، حبیب لبیب

(شان الحق حقی۔تاریخ وفات 1413ھ)

قوم کا شاعر تھا، جالب دوستو
کیا کہوں وہ لولوئے ناشفتہ تھا
اس کی یوں تاریخ ہاتف نے کہی
وہ مشن میں اپنے بے حد پختہ تھا"

(عبدالصمد صارم الازہری تاریخ وفات1413ھ)

اپنے سارے درد بھلا کر اوروں کے دکھ سہتا تھا
ہم جب غزلیں کہتے تھے، وہ اکثر جیل میں رہتا تھا

آخرکار چلا ہی گیا، وہ روٹھ کے ہم فرزانوں سے
وہ دیوانہ، جس کو زمانہ، جالب جالب کہتا تھا

(قتیل شفائی)

اک کھرا شخص، ایک مردِ بے ریا
اک عوامی شاعرِ شعلہ نواء
ناشناسا مصلحت کے نام سے
غیرت و غربت کے سانچے میں ڈھلا

(عبدالعزیز خالد)

نہ تھا مسیح مگر وہ عظیم بے چارہ
ہے اور صدیوں رہے گا، ہماری بے سخنی اور سخن کا کفارہ

(جمیل الدین عالی)

خزاں کی رُت کا مہکتا گلاب تھا جالب
ہمارے عہد کی زندہ کتاب تھا جالب

(خالدعلیگ)

اپنے گریباں کے پرچم میں لوگ تمہیں کفنائیں گے
چاہے تم منصور بنو، یا پیروی ء سادات کرو

(احمد فراز)

ہر کلی، اس کی ہمیشہ یہ گواہی دے گی
ناز پروردہء جمہور، وہ سچا انساں
اپنی تکمیل کی منزل کی طرف لوٹ گیا
جس کی آواز ہے گلشن میں بہاروں کی طرح

(احمد ظفر)

وہ ایک لمحہ ہزاروں برس پہ غالب ہے
جو آدمی کے لیے عظمتوں کا طالب ہے
وہ ایک لمحہ نہیں ہے، حبیب جالب ہے

(حسن عابدی)

سرِ بساطِ سخن یوں تو ہم نواء ہیں بہت
نہیں ہے ایک بھی جالب، غزل سرا ہیں بہت

(محسن بھوپالی)

خوشحالی عوام کا طالب نہیں رہا
جو تھا بہت حبیب وہ جالب نہیں رہا

(مظفر وارثی)

اپنی دھن میں گاتے گاتے ہوگیا جالب خموش
اور اک نغمہ صلیب مرگ پر، وارا گیا

(اصغر سلیم)

اپنے ڈھب کا شاعر تھا میر تھا نہ غالب تھا
وہ حبیب تھا سب کا، جس کا نام جالب تھا

(اسرار زیدی)

میں کیوں نہ اُس کو سلامی دوں اپنی غزلوں کی
کہ میرے عہد کا شاعر، حبیب جالب ہے

(محسن نقوی)

آخر تمہیں جانا تھا کچھ دیر ٹھہر جاتے
یہ شب کے اندھیرے جو پھیلے ہیں بکھر جاتے

(سلیم شاھد)

منصور کے قامت سے شناسا تو ہوئی خلق
اے ''حرفِ سردار'' یہ اعجاز ہے تیرا

(افتخار عارف)

اندھیری نگری کے باسیوں میں وہی تھا مینارہ روشنی کا
سسکتی، سہمی سی وادیوں میں وہی تھا پیغام زندگی کا

(خواجہ پرویز)

کاروانِ اہلِ محنت کا وہ سالار و امیر
خاکِ افغانی سے اٹھا، جس کی ہستی کا خمیر

(بخش لائل پوری)

'حرف حق' ہی برملا کہنے کے بعد
ہاتھ میں پھر ہتھکڑی کیسی لگی

(جاوید شاہین)

وہ اپنے عہد کا منصور، حرف حق کا نقیب
صلیبِ وقت پہ فائز وہ شخص کب سے تھا

(مسلم شمیم)

آؤ! نیزوں کی پلکوں پر حرف کی گرہیں کھولیں
جالب بول رہا ہے، آؤ ہم بھی بولیں

(نذیر قیصر)

جس آوارہ دیوانے کو جالب کہتے تھے
ہستی کی اس راہ گزر سے اب وہ جاتا ہے
اے مٹی اے ارضِ وطن، لے اپنی باہیں کھول
تیری جانب لوٹ کے تیرا شاعر آتا ہے

(امجد اسلام امجد)

جالب سا اب کہاں ہے کوئی مردِ چیرہ دست
حق کوش و حق نما و حق آگاہ و حق پرست

(حسین انجم)

چاند روپک سی نگاہوں کی اداسی کا فسوں
اب ترستے ہیں ترے پیار کی شبنم برسے
رات کا چاند بھی یخ ہو کے کہیں دور چھپے
پھر افق پر تری سوچوں کا سحر کا وہ کنارا چمکے

(نجم الحسن عطا)

اب کون اہلِ درد کی لکھے گا داستاں
جب دردِ دل کا چاہنے والا ہی مرگیا

(اسلم گورداسپوری)

ہم کو یاد ہے جالب تو نے
اک دن آ کے "سرِ مقتل"
قاتل ہاتھ کو پھنچوایا
لہو کا دیپ جلایا

(نقاش کاظمی)

چپ کی چادر تان کے سونے والے بہت ہیں اور وہ ہم ہیں
گونگے شہر میں دستک دیتی ایک صدا ہے اور وہ تم ہو

(حسن عباس رضا)

بہت رویا تھا، دھاڑیں مار کر رویا تھا
کل شب آسمان
اور آج بستی کی منڈیروں پر
صفیں باندھے کھڑی ہے دھوپ کہتے ہیں
کہ وہ شوریدہ سر
پھولوں کی بکل مار کر گزرے گا
ان چپ چاپ سڑکوں سے
وہ شوریدہ سر
اس آج کی تاریخ، وسطِ موسم گل میں
ہری چادر بدن پر اوڑھ کر
گزرے گا کہتے ہیں
کہ قبرِ شام پر انبوہ کے انبوہ لوگوں کے
دعا مانگیں گے

اس کے لوٹ کر دوبارہ آنے کی

(آفتاب اقبال شمیم)

جالب کا خیال آ رہا ہے
شاعر تھا بہادر اور عوامی

(صابر ظفر)

ایسا بے باک ریختہ میں نہیں، سب کو دیکھا ہے میر و غالب تک
ذکر جب چھڑ گیا شجاعت کا، بات پہنچی حبیب جالب تک

(ظفر اللہ پوشی)

بھنور ایسا تھا وہ جمہوریت کا
کہ جس میں گھر کے آمر ڈولتا تھا

(ریاض الرحمان ساغر)

ہماری اس سرزمیں پہ جب بھی
وقارِ انساں، حقوقِ محنت کشاں کے نعرے بلند ہوں گے
تو ان میں جالب کے سوزِ جاں سے
دہکتے ، بے باک، سچے لہجے کی گونج ہوگی

(حسن اکبر کمال)

رہ کے بس اک اصول پر قائم
دام بے دام کر گیا کوئی

(رزاق مکیش)

نہ آسمان جھکا، اور نہ زمیں ہلی
دیکھنے والوں نے دیکھا درِ زنداں ہوا وا
اک اسیرِ غم دوراں "سرِ مقتل" آیا
عہد سزا ختم ہوا
ایک زنجیر گراں بار کٹی

''حرف حق'' قتل ہوا

وہ کہ ''اس شہرِ خرابی میں'' تھا زنجیر بپا آج آزاد ہوا

(ڈاکٹر عروج اختر زیدی۔کینڈا)

سچ بولنے کی سرمدی عادت کا نام تھا

جالب زمیں پہ دل کی حکومت کا نام تھا

(بیدار سرمدی)

حبیب جالب

تمہاری آنکھیں بغاوتوں کی مشعل جلائے

ہمارے مردہ ضمیر و دل کو جگا رہی ہیں

رُلا رہی ہیں

حبیب جالب

(سیدہ درنجف زیبی)

ایک آشفتہ حال تھا، نہ رہا

شاعرِ بے مثال تھا، نہ رہا

(اطہر رضوی۔کینڈا)

اکھراں وچوں گری مٹی جالب بعد

دریاواں دی مٹی سُکی جالب بعد

(بابا نجمی)

ہونٹ جب بھی سلے

ظلم جب بھی بڑھے

یاد آئے گا وہ

روشنی کی طرح

آگہی کی طرح

(عارف شفیق)

جھکا نہ در پہ کبھی بادشاہِ دوراں کے
خدا گواہ، وہ سر، صاحب کلاہ کا تھا

(ڈاکٹر جمال حسین قادری۔نیویارک

ابھی ہیں لوگ پرانے تو وقت آنے دے
نیا زمانہ کرے گا، تجھے شریک نصاب

(ناصر بشیر)

سنا ہے ایک جالب تھا سو وہ بھی اب نہیں باقی
تو کیا اس ساری بستی میں قلم رکھتا نہیں کوئی

(توقیر چغتائی)

جس کا کلام ''حرف سردار'' تھا جمال
جالب تھا اس کا نام وہ سب کا حبیب تھا

(جمال نقوی)

اکو ہے سی، دردی شاعر، نڈر آتے سیانا
موت نے جھیڑا کھپا پایا، او، نئیں پُوریا جانا

(محمد شریف صابر)

ایس تاریخ دے پچھلے پاسے، اک دوجی تاریخ اے
جو ایس بڈھڑی دھرتی دے چپے چپے کھلری
اس تاریخ وچ
کجھ جھلے سن
جو لوکاں دے دکھاں دا بانا پاکے
عمر لنگھا گئے

(آصف شاہکار۔سویڈن

اسی قبیلے کا انسان تھا وہ جالب ، جوش
کہ جس کو کھو کے، سدا وقت ہاتھ ملتا ہے

(اے۔جی۔جوش

ابھی تو کچھ دیر اور رُکتے حبیب جالب
ابھی تو کچھ دیر اور رُکتے
ابھی تو سکتے میں ہیں مرے
یارو نوحہ گر بھی
کہ جن کی آنکھیں زبان بن کر
کھڑے اندھیروں کو دیکھتی ہیں
ابھی تو زنجیر نوحہ گر ہے

(محمد افضل)

بے بصر شاعری کے دامن پر
داغ جتنے تھے، دھو گیا جالب

(اختر ضیائی۔ لندن)

میں خط لکھوں گا
حبیب جالب کے نام اک دن
اسے سناؤں گا حال اپنا، اسے دکھاؤں گا جسم اپنا
کہ جس پہ کوڑوں کے داغ اب تک
چراغ سا جگمگا رہے ہیں

(فاضل جمیلی)

اس نے پیار کیا
اور آگ کا دریا بھی پار کر ڈالا
کوئی اگر پوچھے کہ یہ کون سا شاعر تھا
وہ پہاڑوں جیسا شاعر تھا

(بیخود بلوچ۔ سندھی نظم کا ترجمہ)

جانڑ والا جے ہووے تسکین دل دی
دسو چیز کیڑی پچھے رہ جاندی

(فقیر حسین شاعر)

اے بے جس شہر کے لوگو
تم جس کو ساری عمر سنگسار کرتے رہے
آج وہ زخم زخم شیشہ گر بھی چلا گیا
جو "حرفِ سردار" کی صداقت تھا
آج وہ خوش گلو نغمہ گر بھی چلا گیا

(ریاض تسنیم۔پشتو نظم کا ترجمہ

رینِدی دنیا تک روے گا، روشن تیرا نام
اے شاعرِ عوام
ثابت قدم ریا تے لڑیا، حق لئی جیلاں وچ سڑیا
سڑکاں اُتے کھایاں ماراں، تینوں لکھ سلام
اے شاعرِ عوام

(بیگم ممتاز جالب

عمر بھر جو لڑتے رہے، جبر و ظلم سے
پھانسیوں کے پھندوں کو ہنس کے چومتے دیکھیں ہیں وہ لوگ

(ہربچن سنگھ ہنڈل۔کپورتھلہ انڈیا۔گرمکھی نظم سے ترجمہ

جالب جو سردار بھی حرف و صدا کو رسوا نہیں ہونے دیتا
زندگی کے البیلے، دیوانے، اس چھیلے کو سلام کہتے ہیں
اے شفق، پختون اُس مردِ دبنگ کو سلام کہتے ہیں

(م۔ر۔شفیق۔ پشتو نظم سے ترجمہ

کیوں سڑکاں دا پیارا، "برگِ آوارہ" سیں
میرے اُتے بھید اج ایہہ کھلیا نئیں

(سائیں اختر حسین لاہوری

حقوقِ انساں کی آگہی تھا "حبیب جالب"
کہ ایک پیغامِ عالمی تھا حبیب جالب

(ڈاکٹر تجمل عباس رانا

حلقۂ شعرو ادب جالب تجھے بھولا نہیں
خدمتِ علم و ادب میں ہی گزاری زندگی
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ سخن کے درمیاں
تو نہیں زندہ، مگر زندہ ہے تیری شاعری

(رشید تبسم)

چل دیا چھوڑ کے عوام کو وہ
گفتگو جس کو کُل عوام سے تھی
جس میں لوگوں کے درد ملتے تھے
شاعری وہ تو اُس کے نام کی تھی

(اختر شمار)

ہرلمحہ ہے تیرا لمحہ،
سب آنے والی صدیوں کا
تاریخ ابد دھرائے گی
جالب تری جرأت کا قصہ

(فہیم شناس کاظمی)

سخن کے باب میں "عہدِ سزا" کے رستے میں
بس ایک تو ہی چلا سر اٹھاکے رستے میں

(ڈاکٹر نثار ترابی)

کوئی جالب سا ہے اب کہاں باوفا
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

(عبدالعلی شوکت)

رہا وہ آزاد زندگی بھر، کوئی بھی حاکم ہوا نہ غالب
وہ ظلم اور ظلمتوں کا دشمن وہ حسن اور روشنی کا طالب

وہ پردہ سطح پر بھی چھایا مشاعروں کو بھی اس نے لوٹا
وہ میر و غالب کا ہم پیالہ، عظیم شاعر حبیب جالب

(تشنہ بریلوی)

دُور تلک سناٹا ہے، کون آئے گا
اپنے لہو کے دیپ جلانے تیرے بعد

(سعید پرویز)

جالب فیض کی نظر میں

عوام نے حبیب جالب کو شاعرِ عوام کہا اور وقت کے بڑے اہم شاعر فیض احمد فیض نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی۔ انہوں نے کہا ''ولی دکنی سے آج تک کسی ''شاعر'' کو اتنے سامع نصیب نہیں ہوئے جتنے حبیب جالب کو ہوئے'' ڈاکٹر ایوب مرزا کو فیض صاحب کا ایک طویل انٹرویو جو ایک گفتگو کی شکل میں موجود ہے اور کئی سالوں پر یہ گفتگو محیط ہے۔ یہ گفتگو کتابی شکل میں بھی موجود ہے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد کا شائع کردہ ایڈیشن میرے سامنے ہے، سن اشاعت 1996 درج ہے۔

(74) ''ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں ''باتوں باتوں میں ذکر وارث شاہ، بلھے شاہ، بابا فرید، میاں محمد، سلطان باہو وغیرہ کا چھڑ گیا۔ کہنے لگے ''بھئی اصل بات یہ ہے کہ ہم ان کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ بہت بڑے شعراء ہیں۔ درحقیقت یہ عوامی شعراء ہیں ذرا غور کرو ان کے پاس پبلشر کہاں تھے۔ چھاپے خانے کدھر تھے اور ان کے پروموٹر اور دھڑے بند بھائی کہاں تھے، مگر ان کے اشعار اور قصے دیہاتوں میں زبان زدِ عام تھے۔ ان کی بے پایاں مقبولیت، ان کی شاعرانہ عظمت کی نشان دہی کرتی ہے۔ ان قصوں میں انہوں نے اُس وقت کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالت کی بہت اعلیٰ درجے کی عکاسی کی۔ اس وقت کے رسم و رواج اور رائج الوقت محبتوں کے اصولوں کو اپنی شاعری میں بہتر اسلوب میں رقم کیا ہے۔''

ڈاکٹر ایوب مرزا فوراً ہی آگے لکھتے ہیں ''میں نے گستاخانہ لہجے میں کہا ''فیض صاحب آپ کی شاعری عام آدمی کے سر سے گزر جاتی ہے۔ اگرچہ آپ کی شاعری کی اساس عوامی ہے۔ کہنے لگے ''ہم کب کہتے ہیں کہ ہم 'عوامی' شعر کہتے ہیں'' پھر مسکرائے اور کہا '' بھئی اس کے لیے ہمارے پاس حبیب جالب جو ہے'' ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں۔ میں نے فیض صاحب کو بتایا کہ ایک مرتبہ حبیب جالب سے اس موضوع پر بات ہوئی وہ کہتا ہے کہ فیض محض میرے لیے لکھتا ہے''

جالب صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ ''میں فیض کے پیغام کو عام کر رہا ہوں''

جالب، فیض صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے اور فیض، جالب سے حد درجہ پیار۔ ایک قصہ یاد آ گیا، فیض صاحب کو لینن پرائز ملا تو جالب صاحب مبارک باد دینے گھر پہنچ گئے فیض صاحب کو انعام ملنے پر مبارک باد پیش کی اور پھر کہا ''فیض صاحب نقد بھی مل گیا؟'' فیض صاحب بولے ''ہاں'' تو جالب صاحب نے ان سے کہا ''میرے حصے کے دو سو روپے میری جیب میں ڈال دیں'' فیض صاحب بولے ''نہیں تم کو صرف چائے ملی گی اور جالب کہتے ہیں کہ بالآخر میں دو سو روپے لیکر ہی ٹلا۔'' اس واقعے میں دونوں طرف محبتوں کے سلسلے اور پیار کی انتہائیں محسوس کی جاسکتی ہے۔ فیض جتنے بڑے شاعر تھے ''اعتراف'' کی قوت بھی خدا نے انہیں اسی قدر عطا کی تھی۔ وقت گواہ ہے جالب کچھ دن نہ ملتے تو فیض لوگوں کو دوڑاتے کہ ''جالب کو ڈھونڈ کر لاؤ۔''

دیباچے

عہدِ ستم

''عہدِ ستم'' تاریخ اشاعت، مارچ 1980۔ سید سبط حسن لکھتے ہیں ''اردو زبان نے نظیر اکبر آبادی کے بعد اگر سچ مچ کوئی عوامی شاعر پیدا کیا ہے تو وہ حبیب جالب ہے نظیر اکبر آبادی کی طرح وہ بھی عوامی انسان ہیں، ان کا رہن سہن عوامی ہے، ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز عوامی ہے، ان کی قدریں عوامی ہیں، ان کی محبتیں اور نفرتیں عوامی ہیں اور وہ عوام کے دکھ درد، آرزوؤں اور امنگوں کی ترجمانی عوام ہی کی زبان میں کرتے ہیں، یہ جو ہزاروں لاکھوں انسان حبیب جالب سے اتنا پیار کرتے ہیں اور ان کے اشعار سن کر فرطِ جذبات سے بے قابو ہو جاتے ہیں تو ان کا پیار، ان کی وارفتگی بے سبب نہیں ہے۔

یونانی دیومالا کے ہیرو پرومیتھوس کا قصور یہ تھا کہ اس نے انسان کو آگ کا استعمال سکھایا تھا اور اس طرح دیوتاؤں کا راز انسانوں پر افشاں کردیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں دیوتاؤں نے پرومیتھوس کو چٹان سے بندھوا دیا تھا جہاں ایک گدھ دن بھر اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتا تھا۔ اس اذیت ناک سزا کے باوجود جب دیوتا اس سے کہتے کہ معافی مانگ لے تاکہ اس عذاب سے چھٹکارا ملے تو وہ جواب دیتا کہ مجھے یہ اذیت منظور ہے مگر تمہاری غلامی نامنظور۔

یہ ایک رمزیہ کہانی ہے ورنہ شعور و آگہی کی ذات دیوتاؤں کے دربار سے کبھی نہیں آئی بلکہ انسان نے سدا اپنے تجربے، مشاہدے اور قوائے عقلی کی مدد سے تحقیق و تخلیق کے مراحل طے کیے ہیں اور فہم و ادراک کی بلندیوں تک پہنچا ہے، البتہ تاریخ کے ہر دور میں ہمیں ایسے خطر پسند ملتے

ہیں جنہوں نے ہمیں حریت ذات کا درس دیا اور ہمارے سماجی شعور کی لو تیز کی۔ ایوب خان کی آمریت اس لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گی کہ اس تاریک دور میں جسٹس کیانی مرحوم اور حبیب جالب ابھر کر سامنے آئے۔ جب کبھی اس ملک کی سچی تاریخ لکھی جائے گی تو دنیا کو معلوم ہوگا کہ خوف اور دہشت کی اس فضا میں سانس لیتے ڈر لگتا تھا اور انہوں نے قوم کی ڈوبتی نبض میں کس طرح زندگی کا خون دوڑایا۔

کانٹوں کی پیاس بجھانا حبیب جالب کی زندگی کا مقدر بن گیا ہے اور چارہ غم کی نوید سنانا ان کا مسلکِ زیست۔ وہ اگر ایک آنکھ سے روتے اور دوسری آنکھ سے ہنستے ہیں تو ان کا یہ رونا اور ہنسنا دونوں عوام ہی کے حوالے سے ہے۔ وہ روتے ہیں عوام کے حال زار پر اور ہنستے ہیں ان کے روشن مستقبل پر۔ ان کی شاعری شکست صدا بھی ہے اور سوزِ یقیں کی للکار بھی۔ وہ دل توڑنے والوں کے ثروت و اقتدار سے کبھی نہیں ڈرے بلکہ اندھیرے کے بچاریوں نے شب خون مارنے کے بعد جو نقاب بھی اوڑھی حبیب جالب نے اس کو نوچ کر پھینک دیا۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس درویش خاک نشیں میں یہ جرأت انکار کہاں سے آئی۔ وہ کون سی قوت ہے جو اس نیک دل اور نرم خو انسان کو باطل سے لڑنے اور حق کا اقرار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ درحقیقت وہ قوت عوام کی محبت اور وہ چشمہ حیواں جو حبیب جالب کو ولولہ اور جوش عطا کرتا ہے، عوام کی طاقت ہے۔ حبیب جالب نے اپنی شخصیت اور شاعری کو عوام کی خاطر وقف کر دیا ہے۔ اس کی شاعری مرعوب کن علامتوں اور استعاروں کی بیساکھی لگا کے نہیں چلتی۔ وہ سماجی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتا ہے، لگی لپٹی نہیں رکھتا کہ اس کے مذہب میں مشاہدۂ حق کی گفتگو بڑی براہ راست ہونی چاہیے نہ کہ بادہ و ساغر کی آڑ میں یا موٹی موٹی کتابوں کے انبار میں۔

حبیب جالب بے شک لمحے کا شاعر ہے، مگر یہ کتنا طویل لمحہ ہے کہ صدیاں گزر گئیں لیکن اس لمحے کا درد کم نہیں ہوتا۔ یہ لمحہ ہمارے زوال و شکست، ہماری مجبوریوں اور مظلومیوں، ہماری جدوجہد اور قربانیوں کی نہ ختم ہونے والی داستان ہے۔ جس کو حبیب جالب کا خونچکاں قلم فن کے

پیرائے میں بیان کرتا رہتا ہے۔ ان کی شاعری پاکستان کی منظوم تاریخ ہے، ایک مرقع ہے، جس میں حبیب جالب نے لمحے کی ہر چبھن، ہر ٹیس کی بڑی مخلصانہ نقش گری کی ہے۔

(سید سبط حسن)

"گنبدِ بے در"

""گنبدِ بے در" 1983 میں پہلی بار شائع ہوئی۔ جنرل ضیاء کا دور تھا اور اس کتاب کو ضبط بھی کیا گیا اس کے فلیپ پر محترم آئی، اے رحمٰن لکھتے ہیں "جیل جانا حبیب جالب کے معمولات میں شامل ہے بلکہ اُس جیسے سچے، کھرے، بے باک، ضدی ہر حال میں پسے ہوئے عوام کے سلے لبوں کو متحرک کرنے والے شاعر کا جیل سے باہر رہنا غیر معمولی واقعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جب بھی جالب پابندِ سلاسل کیا گیا اس کے ذہن نے وہ تمام پابندیاں بھی توڑ ڈالی ہیں جو ہمارے ملک کے فنکاروں اور ادیبوں کو سچ سے گریز پر مائل کرتی ہیں۔

خمارِ رسوم و قیود کے سرگشتہ مجھ جیسے نیم صحافی سے یہ سطور لکھنے کی فرمائش غالباً اس لیے کی گئی کہ میں نے اس مجموعے میں شامل اشعار کو کوٹ لکھپت جیل میں نازل ہوتے دیکھا اور مجھے یہ موقع ملا کہ میں اس کیفیت سے آشنا ہوسکوں۔ جب شاعر اور اس کا کلام ایک واحد مربوط حقیقت کی صورت میں سامنے آئیں، ظاہر ہے جیل میں شاعر بعض عارضی حوادث سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ جالب جیسے درویش کے لیے ہر صبح، ایک نئی پریشانی کا پیغام لے کر آتی تھی۔ چند اشعار ایسے ہی ذاتی تفکرات کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن مجموعی طور پر ان اشعار میں اس درد کی کسک نظر آتی ہے جو 1981 کے بہار میں پاکستان کے عوام کا سرمایہ تھی اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اس تمام عرصے میں جالب ایسا ہی آزاد، خوددار، نڈر اور خوش گو تھا جیسا وہ ان اشعار میں نظر آتا ہے۔

(آئی۔ اے رحمٰن)

"جالب نامہ"

"جالب نامہ" پبلشر۔ جنگ پبلشرز لاہور، ناشر میر شکیل الرحمٰن۔ بار اول 1991 جناب علی

سردار جعفری لکھتے ہیں۔

اگر ایں کار را کارِ نفس دانی چه نادانی
دمِ شمشیر اندر سینه باید، نے نوازی را

(اقبال)

حبیب جالب کی ہر سانس تلوار کی دھار ہے۔ پاکستانی شاعری کی دو نمایاں آوازوں میں ایک آواز فیض کی ہے اور ایک آواز حبیب جالب کی، وہی دھار جو اس کے شعروں میں ہے۔ اس کے ترنم میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہ بڑا شاداب ترنم ہے، جب میں نے برسوں پہلے حبیب جالب کا کلام شاید دہلی میں سنا تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ ترنم ان کے اشعار کے لیے ہے اور یہ اشعار اس ترنم کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں، حرف حرف نغمے کے اندر ڈھلتا چلا جاتا ہے۔

حبیب جالب کی آواز ہمارے انقلابی عہد کے اجتماعی ضمیر کی آواز ہے جو مختلف لہجوں مختلف زبانوں اور مختلف ملکوں میں ایک ساتھ بلند ہوئی ہے۔ یہ بیسویں صدی کی آواز ہے۔ اس کا ایک نام قاضی نذرالاسلام ہے (بنگالی) ایک نام ناظم حکمت ہے (ترکی) ایک نام پابلو نرودا ہے (ہسپانوی) ایک نام محمود درویش ہے (عربی) ایک نام مایا کوفسکی ہے (روسی) ایسے بہت سے چھوٹے بڑے ناموں سے مل کر اس عہد کی کہکشاں بنی ہے جو ہمارے کرہ ارض کی اندھیری راتوں کو روشن کر رہی ہے۔ ہم اس کو ایک ایسی خوبصورت دھنک بھی کہہ سکتے ہیں جس کا ایک رنگ، محبوب کے ہونٹوں کا تبسم ہے، دوسرا رنگ معصوم بچے کی معصوم نگاہ، تیسرا رنگ ہرے بھرے لہلہاتے کھیت کی شادابی، چوتھا رنگ آہن گر کی دکان کا شعلہ، پانچواں رنگ انقلاب کا پرچم، چھٹا رنگ پس دیوار زنداں ظلم سہتے ہوئے مجاہد کی للکار اور ساتواں رنگ طلوع آفتاب، جو ہر عالم میں طلوع ہوتا ہے۔ آفتاب کبھی بے وفائی نہیں کرتا، دھوکا نہیں دیتا۔

حبیب جالب کی شخصیت میں مجھے سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کی شخصیت کی بھی ایک جھلک محسوس ہوتی ہے۔ کردار کی صلابت کے ساتھ ایک فولادی عزم، جس نے مولانا کو کسی ظلم، کسی سختی کے سامنے سر نہیں جھکانے دیا۔

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے، حسرت کی طبیعت بھی

انہوں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ قید خانوں میں گزارا۔ یہ سلسلہ 1908 سے شروع ہوا اور 1947 تک جاری رہا۔ ایک قدم جیل کے اندر ایک قدم جیل کے باہر، کچھ یہی عالم حبیب جالب کا بھی رہا ہے۔ انہیں قید خانوں کی زندگی شاید کچھ ضرورت سے زیادہ عزیز تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب وہ جیل سے باہر ہیں اور آزاد ہیں اور اپنی نظموں کی نئی کتاب شائع ہونے کے منتظر ہیں۔ وہ جس شہرت اور مقبولیت کے مستحق ہیں وہ انہیں ملی لیکن ان کا مقدر تنہائی ہے میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ آج اقدار کا بحرانی دور ہے اور عقیدتوں کے چراغ بُجھ رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے اندھیرا اس ساری کائنات کو نگل جائے گا تو ایک آتش نفس شعلہ نوا شاعر کی آواز، انسانیت کا سہارا بن جاتی ہے جو آبروئے عشق کی حفاظت کر رہا ہے۔ یہ بڑی قیمتی آواز ہے۔ مبارک ہے وہ ملک جس کو فیض اور جالب کی آواز ملی۔

(علی سردار جعفری 19/مئی 1991)

جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

(جالب کی شاعری کے انتخاب کا دیباچہ)

حبیب جالب ہمارے معاشرے اور ہمارے زمانے کا قلندر تھا۔ اب قلندری کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ پچھلے معاشرے کے ماحول میں (جسے اصطلاحاً روایتی معاشرہ کہا جاتا ہے۔ زندگی کی ایک لہر قلندری کی بھی تھی۔

جس معاشرے کا ہم نے ذکر کیا ہے اس کے دو قطب تھے، شمالی قطب تو بادشاہ کا دربار تھا، جنوبی قطب فقیر، صوفی کی خانقاہ تھی، وہ بھی اپنی جگہ شاہ ہوتا تھا۔ بادشاہی اور شاہی کے ان دو ستونوں پر معاشرہ قائم تھا اور ان ہی قطبین کی باہمی رقابت سے معاشرے کا کلچر پیدا ہوتا تھا۔ اس کلچر کا ایک خاص نمائندہ شاعر ہوتا تھا۔

شاعر کا دربار میں ایک مقام تھا، لیکن اسے سلطنت کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کی نظر میں تو نظام دنیوی قیامِ ہستی کے لیے خدا کی طرف سے قائم کردہ ایک ستون تھا اور جب وہ مختلف تقریبات پر قصیدہ پیش کرتا تھا تو اس کے پیش نظر کوئی خاص شخص نہیں ہوتا تھا بلکہ مقام بادشاہت کی مثالی صفات ہوتی تھیں، جنہیں وہ اپنے فن کے زور پر اُجاگر کرتا تھا۔ روحانی تعلق اس کا دوسرے عوامی قطب سے تھا۔ وہیں کی حقیقتیں زندگی کے گوناگوں مجازی پردوں میں جھلکتی تھیں، جس کا خاص ذریعہ اظہارِ غزل تھی۔ غزل زبان و بیان کے ذریعہ انسانیت کے کلچر کی ترجمان تھی۔ اس کلچر کے ریاض کے لیے استادی، شاگردی کی ایسی ہی ضرورت تھی، جیسی روحانی کلچر کے لیے مُرشد اور مرید کا سلسلہ۔

غزل ہر قسم کی دنیاداری اور ہر قسم کے تصنع اور مکر و ظلم کے خلاف ایک جہاد ہے، جس کے علامت شیخ یا زاہد یا محتسب ہے۔ جسے ہم اپنی زبان میں ''مُلا'' کہنے لگے ہیں۔ غزل کا بنیادی تضاد عشق اور ہوس کا تضاد ہے اور ہوس کی علامت رقیب ہے، اور ہر قسم کی ہوس سے آزادی کا راستہ عشق ہے۔ زمین اور آسمان کی دنیا میں انسان مجبور ہے۔ زمین سخت ہے، آسمان دور ہے، لیکن دل کی دنیا میں وہ آزاد ہے، 'جنون' کے لیے ''صحرا'' بھی ہے اور ''فردیت'' کی معراج کے لیے ''فرازِ دار'' بھی ہے۔ قلندر اسی بغاوت اور اسی آزادی کا نقیب ہے۔

جب انسان نے یہ حقیقت دریافت کی کہ زمین اور آسمان کی دنیا میں بھی وہ مجبور نہیں ہے بلکہ زمین اور آسمان کو بدل سکتا ہے۔ بادشاہ کا آنکھوں کو چندھیانے والا لباس خود اُسی کی نگاہ کا فریب ہے، ورنہ بادشاہ تو خود ننگا ہے۔ معاشرے کے قارون کے خزانے میں اسی کے خون پسینے کی کمائی ہے تو دنیا ہی بدل گئی اور اُس بغاوت اور آزادی اور قربانی کے اس جذبے کا رُخ جو خانقاہ کی تربیت سے حاصل کیا تھا اقتدار کے فرعونوں اور استحصال کے قارونوں کی سمت موڑ لیا اور اسے اپنی فردیت عوام سے کٹنے میں نہیں بلکہ عوام ہی کا ایک فرد بننے میں نظر آنے لگی۔ اب تمام معاشرہ دو طبقوں میں تقسیم ہو گیا۔ عوام کا استحصال کرنے والے اور عوام۔ ظالم اور مظلوم۔

عشق انقلاب کے لیے ایک تڑپ کی صورت میں ظاہر ہوا اور انسانی رشتوں میں تصوف کی جگہ سیاست نے لے لی۔ سیاست کا شعور اتنا ہی ناگزیر ہوگیا، جتنا کبھی تصوف کا ذوق تھا۔ اب ہمارے شعروادب پر سلیقہ اور فن کاری کے ساتھ یا پھوہڑپن سے، سیاست کا رنگ چھا گیا۔

لیکن جس طرح پچھلے زمانے میں کچھ لوگوں کے لیے تصوف کے معنی، دل میں درویشی اور محبت تھے اور شعر زندگی کی اسی کیفیت کا آئینہ دار تھا لیکن کچھ لوگوں کے لیے تصوف برائے ''شعر گفتن خوب است'' والی بات تھی۔ اسی طرح ''نعرہ انقلاب'' شعر کہنے اور سوسائٹی میں ایک مقام حاصل کرنے کے لیے خوب ہے۔ کچھ لوگ نظریات کا ٹھیکہ لے کر ''مُلا'' بن گئے کچھ لوگوں نے ترقی پسندی کو سیاست کاری بنالیا۔

ہمارا حبیب جالب ان تمام جھمیلوں سے پاک تھا وہ مردِ مومن تھا ''مخلصین لہ الدین''۔ وہ ہمارے معاشرے کی بغاوت اور آزادی کا خالص نقیب تھا۔ وہ ہمارے معاشرے کا اور ہمارے زمانے کا صحیح قلندر تھا اس لیے ہمیں عزیز تھا اور ہے۔

(**پروفیسر کرار حسین** 8/ اپریل 1997)

''گوشے میں قفس کے''

ایک روایت ہے کہ حیدرآباد سنٹرل جیل ہو، اس میں مقدمہ سازش چل رہا ہو سیاسی ملزمان میں سے ایک سیاستدان ملک کا کوئی نامور شاعر ہو وہ جیل میں کوئی کلام مرتب کرے تو جیل کے کسی ساتھی کو ہی اس کا پیش لفظ لکھنا ہوگا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب میں کھڑا اپنے سیل نمبر 19 کی صفائی کر رہا تھا تو جالب صاحب نے ارشاد فرمایا کہ ''مجھے ان کے نئے مجموعہ کلام ''گوشے میں قفس کے'' کا پیش لفظ لکھنا ہوگا۔ جالب صاحب کو انکار کرنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ وہ دوستی کے معاملے میں بے حد حساس واقع ہوئے ہیں میں نے اپنی بے چارگی کو چھپاتے ہوئے اس پر بے پایاں مسرت کا اظہار کیا مگر مٹھیاں بھینچنے کے باوجود ایک ایک کر کے میرے ہاتھوں کے سب چھوٹے بڑے طوطے اڑ گئے کیونکہ مشاعرے میں اٹھ اٹھ کر کسی شعر کی داد دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ داد دینے

والا شخص واجبی سا شعر کہتا ہے اور مجمع بحرِ منجمد شمالی کی طرح پر سکون اور سنسان ہوتا ہے تو سامعین میں سے کسی ''صاحب ذوق'' کی پسلی پھڑک اٹھتی ہے اور وہ اٹھ کر داد دینا شروع کر دیتا ہے۔ مگر پھر چہار سو ہو کا عالم دیکھ کر کچھ کھسیانے بھی ہوتے ہیں اور کپڑے جھاڑ کر پھر اپنی نشست پر لڑھک جاتے ہیں ادب عالیہ کے متعلق اپنا بھی کچھ یہی عالم ہے۔ خیر جالب صاحب تو حکم فرما کر واپس اپنے سیل میں چلے گئے اور میں اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے اس کام کی انجام دہی کے لیے کسی ایسے موزوں آدمی کی تلاش میں رہا جس پر جالب صاحب بھی متفق ہو جائیں۔

ہم لوگوں کو 13 / اپریل 1976 کی صبح کو ملک کے مختلف حصوں سے گرفتار کیا گیا تھا۔ میں اسلام آباد میں اپنے کسی عزیز کی بچی کی شادی سے فارغ ہو کر صبح گاڑی میں سامان رکھ کر گورنمنٹ ہوسٹل میں سینٹ کے لیڈر آف اپوزیشن جناب محمد ہاشم خان غلزئی کو الوداع کہنے گیا تھا۔ غلزئی صاحب اسمبلی کے لیے تیاری فرما رہے تھے۔ اور ساتھ ہی اپنے چند قدر دانوں کے سامنے حالات حاضرہ پر سیر حاصل تبصرہ کر رہے تھے کہ ایف آئی اے کے ایک آفیسر صاحب سفید کپڑوں میں نمودار ہوئے۔ میں نے معاملہ کی نوعیت کا اندازہ کر لیا اور مسکرا کر ان کا استقبال کیا۔ وہ بھی جواباً مسکرا دیے اور میرے قریب کرسی پر بیٹھ گئے غلزئی صاحب نے بکمال شفقت انہیں سمجھانا شروع کر دیا کہ وہ آج اسمبلی میں ایسا ریزولیوشن پیش کریں گے کہ سرکاری بینچوں کے پاس جواب ہی نہیں ہوگا۔ آفیسر صاحب نے سرگوشی میں مجھے کہا کہ میں انہیں ان کی آمد کے مقصد سے آگاہ کر دوں۔ میں نے عرض کیا غلزئی صاحب آپ آج اپنا ریزولیوشن پیش نہیں کر سکیں گے۔ ہاں بھئی دیر ہو رہی ہے اور مجھے ابھی نہانا بھی ہے، یہ کہہ کر وہ پلنگ سے اٹھنے لگے۔ میں نے عرض کیا۔ حضور آپ زیر حراست ہیں۔ انہوں نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے کہ میں کوئی پولیس آفیسر ہوں۔ اور آج تک ان سے اس بات کو چھپائے ہوئے ہوں۔ میں نے انہیں مطلع کیا کہ میں اور سینیٹر سید حسین شاہ صاحب بھی زیرِ حراست ہیں اور یہ کہ میں کوئی سلطانی گواہ نہیں ہوں۔ پولیس آفیسر نے اٹھ کر اپنا تعارف کرایا اور اپنے مشن سے آگاہ کیا۔ دوسری صبح ہم جیٹ پر سوار

کراچی کی طرف روانگی کے لیے تیار تھے کہ خان عبدالولی خان سہالہ سے اپنی گارڈ سمیت آن پہنچے اور ہمراہ ہو گئے۔ عین اس وقت جب ہمیں گرفتار کیا گیا۔ حبیب جالب لاہور میں اپنے گھر میں صفِ ماتم بچھائے اپنے بچے کی رسم سوئم پر فاتحہ پڑھتے ہوئے دھر لیے گئے اور کراچی ائیرپورٹ پر ہم سے پہلے حاجی غلام احمد بلور، امیر زادہ خان سمیت موجود تھے۔ جب سب حیدرآباد سنٹرل جیل کے گیٹ پر پہنچے تو دروازہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام قیدی بیک وقت پہنچے ہیں۔ افراتفری کا عالم تھا، بیشتر حضرات دیگر جیلوں سے لائے گئے تھے۔ نوجوان قیدی انقلابی نعرے لگا رہے تھے۔ زندانیوں کو سیل الاٹ کیے جا رہے تھے دو دو چار چار کی ٹولیوں میں ادھر ادھر تقسیم کیا جا رہا تھا۔ ارشاد ہوا کہ جالب اور گردیزی صاحب کو پھانسی کی کوٹھڑیوں کی طرف لے جاؤ۔ اپنا تو خیر اڑنے سے پیشتر ہی رنگ زرد تھا۔ جالب صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ پھانسی کے معاملے میں آخر عجلت کیوں کی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ ہم احاطے میں پہنچے تو کراچی کے نامور بیرسٹر عزیز اللہ شیخ پہلے ہی کھلے آسمان تلے بیٹھے انجم شماری میں مصروف تھے۔ انہوں نے پرجوش استقبال کیا۔ کچھ دیر بعد جناب شیر محمد مری بھی اپنے ساتھیوں سمیت آ پہنچے۔ دیکھتے ہی دیکھتے احاطہ کھچا کھچ بھر گیا اور پھانسی کی ان کوٹھڑیوں پر ایک ہوسٹل کا گمان ہونے لگا۔ حقیقت میں ان کوٹھڑیوں کا حلیہ بدل دیا گیا تھا اور وہاں عوام کی سہولت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ روٹی اور مکان کی حد تک تو ہم لوگ مطمئن تھے۔ البتہ دیواریں خاصی اونچی تھیں۔ قیدی تین احاطوں میں بند تھے مگر شام تک ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت تھی۔ قیدیوں میں سے میر غوث بخش بزنجو اور نواب خیر بخش مری پہلے ہی موجود تھے۔ سردار عطاء اللہ مینگل کراچی سے لائے گئے اور باقی ماندہ ملک کی مختلف جیلوں اور شہروں سے لائے گئے تھے۔ دوسری صبح جیل کے اندر ہی تمام ملزمان کو اسپیشل کورٹ کے سامنے پیش کر دیا گیا جس کی سماعت تا حال جاری ہے جیل میں دو اڑھائی ماہ گزر چکے تھے۔ جب حبیب جالب نے مجھے پیش لفظ لکھنے کا حکم دیا۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے میں کسی موزوں آدمی کی

تلاش میں تھا۔ ارباب سکندر خان خلیل اور محمد افضل خان صاحب شاعری سے زیادہ بیڈ منٹن میں دلچسپی لیتے تھے۔ کرنل سلطان احمد صاحب کے سامنے اگر شعر پڑھا جائے تو وہ شیروں کے شکار کی داستان بیان فرما دیتے۔ میر گل خان نصیر کسی ترجمہ کے سلسلے میں موزوں الفاظ کی جستجو میں رہتے۔ جناب شیر محمد مری تو خیر خود ہی شیر تھے ان سے گوریلا جنگ پر تو بات کی جا سکتی تھی شاعری میں ان کی دلچسپی محدود تھی۔ ہمارے سیلوں کی قطار میں پنجاب کے بہادر سپوت کرنل لطیف افغانی تھے۔ جو سری نگر کے محاذ پر اپنا لوہا منوا چکے تھے مگر بدقسمتی سے اردو پر انہیں اتنا ہی عبور حاصل تھا جتنا مجھے اور قارئین کرام کو لاطینی زبان پر ہو سکتا ہے۔ بمبئی میں تعلیم پائی اور پنجابی زبان بھی بھول گئے۔ اگلے سیل میں جناب عزیز اللہ شیخ تھے۔ سندھی ان کی مادری زبان تھی اور انگریزی ان کا اوڑھنا بچھونا، باقی تمام زبانوں پر انہوں نے جیل کے تین ماہ ہی میں عبور حاصل کیا۔ قرآن کریم معہ تفاسیر پڑھ لیا اور میں بھی ان سے مستفیض ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ گھنٹہ فی کتاب کے حساب سے پڑھتے دیوان غالب اور کلام اقبال پر ایسا عبور حاصل کیا کہ جب غالب کے شعر پڑھتے تو دل دہل جاتا۔ کوئی شعر بھی ایسا نہیں تھا جس کی انہوں نے تصحیح نہ فرما دی ہو۔ غالب کو تو خیر چھوڑیے مگر اقبال کا ایک تصحیح شدہ شعر آپ بھی سن لیجئے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا خود بندے سے آ کر پوچھے کہ میاں اب تو بتا یہاں تیری رضا کیا ہے۔ میں تو خیر ان کا مداح تھا۔ انہیں داد دے ہی دیتا مگر جالب صاحب قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے اور میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ میں ایک میزبان اور قیدی ہونے کی حیثیت سے کہاں جاتا۔ ظاہر ہے سینے پر ہاتھ مار کر داد دیتا رہتا۔ ایک مرتبہ جالب صاحب میرے سیل میں بیٹھے ایک مصرع موزوں کر رہے تھے۔ زمین کچھ اس قسم کی تھی۔ سردار آ گئے، وغیرہ شامت اعمال کہ شیخ صاحب آ گئے اور انہوں نے سن لیا۔ انکسار سے فرمایا۔ جالب صاحب اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں چند جملے تجویز کرتا ہوں اگر آپ ان میں سے کوئی موزوں کر لیں تو شعر حسین ہو جائے گا۔ دراصل آپ انقلابی

شاعر ہیں اور یوں بغیر کسی مزاحمت کے سر دار آ جانا اچھا نہیں لگتا اور پھر جالب صاحب سے جواب موصول ہوئے بغیر فرمایا۔ دار پر رسی پکڑ کر چڑھ گئے اور دوسری طرف سے کود گئے۔ ''یا'' دار پر سپاہی کو دھکا دے کر علاقہ مجسٹریٹ کو تھپڑ مار کر بھاگ گئے۔ اور کہنے ہی والے تھے کہ جالب صاحب دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر دروازے سے باہر نکل گئے۔ میں بھی تو دل کا مریض تھا۔ میں نے ہاتھ ان کے پاؤں پر رکھ کر رحم کی اپیل کی۔ شیخ صاحب نے ہنسنا شروع کر دیا۔ بھئی ادب پر کسی کی اجارہ داری تو نہیں۔ یہ کہہ کر ہنسنے لگے اور اتنے ہنسے کہ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ مگر اس کے بعد ادب پر ان نئے تجربات کو انہوں نے اپنے سیل تک ہی محدود رکھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ہی جالب صاحب کے حکم کی اپنی بساط کے مطابق تعمیل کروں گا۔ ہمارے گروہ میں اہل علم و دانش کی کمی نہ تھی۔ مگر زبان کا مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایک ایسے شاعر کے حیات کا دیباچہ لکھنا سعادت سے کم نہیں جو انسانی عظمت اور سربلندی کے لیے کوچہ یار کو خیر باد کہہ کر سوئے دار خوشی خوشی جائے اور اسے خون دل سے منور رکھے۔ جالب کی مجبوریاں ناتمامیاں اور اس پر یہ حوصلہ، اسے اپنے دور کے شعراء میں یقیناً ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ کوئی جالب کو معمولی آدمی سمجھے تو شوق سے مگر وہ انمول ہے۔ جالب کو دور جدید کی ڈپلومیسی سے چڑ ہے وہ جو کہتا ہے۔ برملا کہتا ہے۔ جالب کے کلام میں اشارہ یا کنایہ کم ہے۔ اگر کہیں اشارہ ہے تو وہ سنگ میل کی طرح واضح منزل کا پتہ دیتا ہے۔ جالب عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کا طرز کلام اتنا سادہ اور آسان ہے کہ زبان زدِ خاص و عام ہے۔ جالب کے کلام کو خالصتاً ادبی معیار پر تو کوئی ادیب ہی پرکھ سکتا ہے مگر میں ایک ادنیٰ سیاسی کارکن ہونے کی حیثیت سے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مستقبل کے مورخ کو وطن عزیز کی سیاسی تاریخ مرتب کرنے کے لیے جالب کے کلام سے جتنا مواد میسر آئے گا وہ شاید اس دور کے معدودے چند نامور ادیبوں کے حصے میں آئے۔ میں نے متعدد مرتبہ دیکھا کہ سیاسی جلسوں میں جالب کو اسٹیج کے قریب پا کر لاکھوں عوام کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوتی ہے وہ کسی لیڈر کو دیکھ کر نصیب

نہیں ہوتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے بتایا گیا کہ جب کسی صاحب نے فیض احمد فیض سے شکایت کی کہ جالب اپنے آپ کو بڑا عوامی شاعر کہتا ہے اور آپ پر بھی فقرے کسنے سے باز نہیں آتا تو وہ مسکرا دیے اور کہا کہ ''بھئی کیا حرج ہے اسے بات کرنے کا حق تو دینا چاہیے۔ دلی دکنی سے لے کر مجھ تک کسی بھی شاعر کو سامعین کا اتنا مجمع میسر نہیں آیا جتنا جالب کو میسر آیا ہے۔'' فراق گورکھپوری نے ایک عرصہ ہوا کلکتہ کے مشاعرے میں جالب کی ایک غزل سے متاثر ہو کر سامعین کے سامنے داد دیتے ہوئے فرمایا۔ میرابائی کا سوز اور سورداس کا نغمہ جب یکجا ہو جائے تو اسے جالب کہتے ہیں۔

جالب کی ابتدائی زندگی کے متعلق بہت کم مواد ریکارڈ پر ہے۔ مناسب ہوگا کہ ذرا اس دور کی بات کریں جب جالب ایک غیر اہم بچہ تھا۔ جالب کا خاندان غزنوی دور میں ہندوستان میں وارد ہوا۔ سلاطین غزنی آتے جاتے رہے۔ مگر پٹھانوں کا یہ قبیلہ ہندوستان کی وسیع اور عریض وسعتوں میں کھو گیا اور بے شمار دیگر فوجی قبائل کی طرح یہیں کا ہو گیا۔ 24 مارچ 1928 میں جالب ضلع ہوشیار پور کی تحصیل دسوہہ کے گاؤں میانی افغاناں میں پیدا ہوئے اور وہیں پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ ان کے بڑے بھائی جو شاعر بھی تھے۔ دہلی جا کر ملازم ہو گئے اور اس دوران جالب کا تمام خاندان دہلی منتقل ہو گیا۔ جالب صاحب میٹرک تک اینگلو عربک اسکول اجمیری گیٹ میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ دہلی میں لڑکپن ہی میں اپنے بھائی کے ساتھ مشاعروں میں جاتے اور دادِ سخن دیتے اور دہلی کے شعرا کے کلام سے متاثر ہوتے رہے۔ پندرہ برس کی عمر میں کلاس روم میں استاد نے طالب علموں سے جب وقتِ سحر کو کو محاورہ میں استعمال کرنے کے لیے کہا تو جالب نے فی البدیہ ایک شعر کہہ دیا۔

وعدہ کیا تھا آئیں گے امشب ضرور ہم
وعدہ شکن کو دیکھتے وقتِ سحر ہوا

استاد چونک پڑے اور جالب کو دل کھول کر داد دی۔

مدتیں ہو گئیں خطا کرتے
شرم آتی ہے اب دعا کرتے

یہ شعر بھی اُسی ابتدائی دور کی پیداوار ہے۔ جالب جگر مراد آبادی سے بے حد متاثر ہوئے۔ جگر مراد آبادی کی شاعری اور ان کی درویشانہ ہیئت کذائی میں جالب کے لیے اتنی جاذبیت تھی کہ ایک طویل مدت تک وہ ان سے مسحور رہے۔ تقسیم ہند کے بعد جالب خاندان سمیت کراچی میں آباد ہوئے۔ اگرچہ کراچی ایک عرصہ تک اردو شعراء کا مرکز رہا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کراچی کی فضا ان کو راس نہ آئی اور وہ اکیلے لاہور کی جانب روانہ ہوئے لاہور میں زلف آوارہ بے آسرا بے یار ومددگار جالب کو ہر شب نیا میزبان میسر آتا مگر بعض اوقات کوئی بھی اس کی پذیرائی نہ کرتا اور غالباً اس دور نے ان کے ذہن پر احساس محرومی کا ایک مستقل نقش چھوڑا اور طبیعت معاشرے سے بغاوت پر مائل ہوئی۔ لاہور کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں اپنا کلام سناتے رہے۔ ان دنوں ایک مشاعرے کا اہتمام ہوا جگر مراد آبادی بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ مشاعرہ عروج پر تھا۔

جالب کو اسٹیج پر بلایا گیا انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی غزل پڑھی۔

دل کی بات لبوں پر لاکر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

سامعین نے کھڑے ہوکر داد دی۔ اس مشاعرے میں جگر مراد آبادی صاحب سے تعارف ہوا اور انہوں نے جالب کو گلے لگالیا۔ لائل پور کے ایک مشاعرے میں جگر صاحب نے جالب کی ایک غزل سن کر جالب سے مخاطب ہوکر کہا ''اگر میرا شراب خوری والا دور ہوتا تو میں مشاعرے میں رقص کرنا شروع کر دیتا۔'' کراچی میں قیام کے دوران جالب متعدد شعراء سے متعارف ہوئے جن کی صحبت میں وہ نکھرے مگر پاکستان میں جالب آزادی، خوشحالی کے متلاشی تھے جو انہیں کہیں نظر نہ آئی اور آہستہ آہستہ ان کے سب سہانے خواب بکھر گئے اور وہ سب کچھ تیاگ کر باغی ہوگئے۔ انہیں کہیں سکون میسر نہیں آیا۔ اس دوران ان کی سندھ کے مشہور کسان رہنما حیدر بخش جتوئی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ وہ کچھ عرصہ ان کی رہنمائی میں سندھ ہاری تحریک میں کام کرتے رہے۔ مگر یہاں بھی انہیں کسانوں میں غربت افلاس اور مجبوریوں نے جھنجھوڑا اور وہ پھر لاہور آگئے۔ چند روز کے بے سروسامانی کے بعد انہیں روزنامہ آفاق میں جناب سید نور احمد صاحب

نے پچھتر روپے ماہوار پر پروف ریڈر کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔ جالب کو اس حقیر معاوضے کے لیے قریباً بارہ گھنٹے روزانہ دفتر میں کام کرنا پڑتا تھا۔ لاہور کے معزز بزرگ سید اولاد علی شاہ صاحب گیلانی مرحوم نے جالب کو ایک مستقل مہمان کی حیثیت سے گھر میں رکھ لیا اور کمال شفقت سے اپنے صاحبزادے، سید کاظم شاہ صاحب کی طرح دیکھ بھال کرتے رہے۔ جالب اس خاندان کا جس عقیدت سے ذکر کرتے ہیں۔ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اتفاق کی بات ہے کہ شاہ صاحب کا قیام اپنے مورثِ اعلیٰ کے مزار کے قریب تھا۔ جہاں وہ اکیلے قیام پذیر تھے یا کاظم شاہ صاحب آ کر رہتے تھے۔ اس مکان کا راستہ شاہی محلہ سے گزر کر جاتا تھا۔ جالب ہر شب اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ڈیڑھ دو بجے مکان پر آتے اور عام طور پر پولیس کا کوئی مستعد اہل کار انہیں دھر لیتا اور شاہ صاحب ان کی صفائی پیش کرتے رہتے۔ 52-1951 کا زمانہ تھا۔ ملازمت کے بعد آپ نے سلسلہ تعلیم جاری رکھنے کے لیے اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ بھی لے لیا تھا۔ کم تنخواہ تعلیم اور ملازمت کے بوجھ نے جالب کو ہرا دیا۔ ایک روز شاہ صاحب نے جالب سے دریافت کیا کہ بیٹا کوئی ایسی ملازمت نہیں مل سکتی جو دن ہی کو ختم ہو جائے اور ہر رات کی اس پریشانی سے نجات مل سکے۔ حساس جالب دل برداشتہ ہو گیا اور چند دن بعد تعلیم اور ملازمت کو چھوڑ کر رختِ سفر باندھ کر لاہور کو خیر باد کہا اور پھر کراچی پہنچ گیا۔

اتنی تو خبر ہے کہ پریشان تھا جالب
کس شہر گیا چھوڑ کے لاہور کہیں کیا

خدا جانے شہر لاہور کی شاہراہوں، گلیوں اور کوچوں میں کیا کشش ہے کہ جالب صاحب کراچی میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے اور 1956 میں کراچی سے لاہور آ کر مستقلاً آباد ہو گئے۔ اگرچہ ملتان کی ایک کشادہ سڑک اور صاف آبادی میں ان کے خاندان کا ایک مکان ہے مگر ملتان کے احباب کے تقاضوں کے باوجود جالب لاہور کی ایک گلی میں کرایہ کے ایک مکان میں قیام پذیر رہے۔ ایک رات نصف شب کے بعد میں نے حیدرآباد سنٹرل جیل میں ان کے سیل کے سامنے سے گزرتے ہوئے یہ محسوس کیا کہ جالب جاگ رہے ہیں۔ میں نے یونہی ان کے اندھیرے سیل میں جھانکا۔ انہوں نے مجھے آواز

دی۔ میں معذرت کر کے آگے بڑھ گیا۔ دوسری صبح جالب ناشتے پر مجھے اپنی غزل سنا رہے تھے۔

کچھ لوگ خیالوں سے چلے جائیں تو سوئیں
بیتے ہوئے دن رات نہ یاد آئیں تو سوئیں
محسوس یہ ہوتا ہے ابھی جاگ رہے ہیں
لاہور کے سب یار بھی سو جائیں تو سوئیں

جالب صاحب نے لاہور پہنچتے ہی سیاست کی وادی پُر خار میں قدم رکھا۔ ان کی شاعری کا انداز بدلتا گیا۔ فلموں کے لیے گیت لکھنے اور سرکاری کنٹرول کے اخبارات کا ایک ایک دروازہ ان پر بند ہوتا گیا۔ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے الیکشن کے موقع پر جب ان کی فاقہ مستی عروج پر تھی اور گھپ اندھیری رات میں جب آمریت کے تند و تیز بگولے طوفان کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ جالب جمہوریت کا چراغ لیے عوام کو گلی گلی پہنچ کر طلوع سحر کی نوید سنا رہے تھے۔ ایسے دور میں ان کو جو مقبولیت نصیب ہوئی۔ اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ ایوبی آمریت دور اپنی تمام تر وحشت اور بربریت کے ساتھ پاکستان کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ مری کا ایک مشاعرہ تھا۔ صوبائی اسمبلی کے اسپیکر صدارت فرما رہے تھے۔ بیشتر وزراء حضرات کی وجہ سے مشاعرہ درباری رنگ پیش کر رہا تھا۔ جسٹس محمد منیر صاحب کے علاوہ پاکستان کے بیشتر ارباب بست و کشاد موجود تھے۔ مشاعرے کا آغاز ہوا۔ مشاعرے کے منتظمین حضرات جالب کی موجودگی سے خوش نظر نہیں آتے تھے۔ سید محمد جعفری صاحب ظریف جبل پوری اور جناب شوکت تھانوی بھی تشریف فرما تھے۔ منتظمین نے ان حضرات کو یکے بعد دیگرے مائیکروفون پر بلا کر مشاعرے کو کشت زعفران بنا دیا۔ شوکت تھانوی صاحب کے فوراً بعد منتظمین نے جالب صاحب کو اسٹیج پر بلایا۔ صاف عیاں تھا کہ جناب شوکت تھانوی کے فوراً بعد کسی سنجیدہ نظم یا غزل کا رنگ نہیں جمے گا۔ جالب نے اعلان کیا حضرات میں پہلی بار اپنی نظم دستور پیش کروں گا۔ منتظمین کو کچھ سجھائی نہ دیا۔ جب جالب نے نظم شروع کی تو منتظمین میں سے ایک صاحب نے اٹھ کر کہا کہ یہ موقع نہیں جالب چلائے۔ بیٹھ جائیں میں موقع پرست نہیں ہوں۔ دوسرے لمحے جالب کہہ رہے تھے۔

ایسے دستور کو صبحِ نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

بس پھر کیا تھا مجمع بے قابو ہو گیا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آمر اور اس کے ہم نوا عوام کی عدالت میں پیش ہیں۔ نظم ختم ہوئی تو جالب مشاعرے سے باہر آئے تو مجمع ایک جلوس کی صورت میں ان کے ہمراہ ہو لیا۔ ارباب بست و کشاد کے رنگ فق اور چہرے زرد پڑ گئے۔ دوسری مرتبہ جالب صاحب نے یہی نظم ملتان میرے گھر میں محترمہ فاطمہ جناح کی موجودگی میں پڑھی اس نظم کی وجہ سے جالب صاحب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے وہ مزید نکھر گئے۔ ملک بھر میں ایک باغی شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوئے اور یہیں سے سلسلہ دار و رسن بھی شروع ہو گیا۔ بار ہا در زنداں ان کے لیے کھلتا رہا۔ جالب ایک عوامی شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ دور ایوبی کے آخری سالوں سے آج تک جالب مسلسل مصائب وحشت اور بربریت کا شکار ہیں مگر اب انہیں فاقوں اور محرومیوں سے خوف نہیں محسوس ہوتا۔ جالب اب اپنے معاشرے کے ناسور ختم کرنے کا عہد کیے ہوئے ہیں۔ دور جدید کے فرعون اور قارون نہ تو اسے خوف زدہ کر سکتے ہیں اور نہ خرید سکتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عوام کی امنگوں کی تکمیل کے لیے جو مشکل کام انہوں نے اپنے ذمہ لیا ہوا ہے شاید اس منزل پر پہنچنے تک ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئے۔ جالب کا پہلا مجموعہ کلام ''برگِ آوارہ'' چوہدری عبدالحمید صاحب مالک مکتبہ کارواں لاہور نے شائع کیا۔ چوہدری صاحب ایک شریف النفس انسان ہیں جن کا خاندان اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے مشہور ہے۔ آپ خود بھی شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ''شام صحرا'' چھپ کر مقبول ہوا۔ آپ نے کسی محفل میں جالب صاحب کو سنا اور ''برگِ آوارہ'' کی اشاعت کا ذمہ لے لیا۔ چوہدری صاحب نے ''سرِ مقتل'' بھی شائع کی اور اس کی وجہ سے جالب کی معیت میں تھانے کا منہ دیکھ آئے۔ ''عہد ستم'' پیپلز پبلشنگ ہاؤس کے رؤف ملک صاحب نے شائع کی اور اب چوہدری صاحب ان کے مجموعہ کلام ''گوشے میں قفس کے'' کی اشاعت کا اہتمام فرما رہے ہیں۔

زیر نظر مجموعے کی ہر نظم اور ہر غزل یا قطعہ حیدرآباد سنٹرل جیل میں لکھا گیا۔ جالب جب بھی کوئی نظم یا غزل لکھتے۔ عام طور پر مجھے اس روز سر گوشی میں سنا دیتے تھے۔ اس لیے میں ان کا ہم قفس ہونے کی حیثیت سے اس ماحول اور فضا سے آشنا ہوں اور ہر شعر کے محرکات کا مکمل احساس رکھتا ہوں۔ ذرا آپ بھی دیکھئے کہ مسعود سعد سلمان کا یہ جانشین شب کی تاریکی میں کس طرح نغمہ سرا ہے اور روزن زندان سے طلوع صبح فردا کا منظر دیکھ رہا ہے جالب نے آنے والے دور کی تصویر کشی اس طرح کی ہے۔

کسی لہجے سے نہ مجروح سماعت ہوگی
جہل کے ناز اٹھانے نہ پڑیں گے ہم کو
آس انگیز اندھیرا نہ کبھی چھائے گا
آس کے دیپ بجھانے نہ پڑیں گے ہم کو
غم کے ماروں کی ہر اک شام چمک اٹھے گی
صبح فرخندہ جبیں کی صورت
میں ضرور آؤں گا ایک عہدِ حسیں کی صورت

جالب کی ایک غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ فرمائیے اور جس ماحول میں یہ غزل لکھی گئی اس کے تناؤ کا تصور کیجئے تو یقیناً آپ بھی میری طرح اس سے لطف اندوز ہو سکیں گے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ جالب کے اس مجموعہ کلام کا کوئی بھی شعر لطف اندوز ہونے کے لیے نہیں۔ یہ ہمارے زخم خوردہ معاشرے کے خلاف ایک زہر آلود طنز ہے مگر یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ شاعر کے ہاتھ قلم ہوں گے یا وہ اپنی روش بدلے گا۔

یہ منصف بھی تو قیدی ہیں ہمیں انصاف کیا دیں گے
لکھا ہے ان کے چہروں پر جو ہم کو فیصلہ دیں گے
ہمارے قتل پر جو آج ہیں خاموش کل جالب
بہت آنسو بہائیں گے بہت دادِ وفا دیں گے

مگر جالب اپنا لہجہ بدلنے کو تیار نہیں کیونکہ انہیں اصرار ہے کہ ۔

بہت مشکل مری پہچان ہوگی
بدل ڈالوں اگر میں اپنا لہجہ

اس ضمن میں وہ آگے چل کر کہتے ہیں ۔

دنیا ہے کتنی ظالم ہنستی ہے دل دکھا کے
پھر بھی نہیں بجھائے ہم نے دیے وفا کے
تاعمر اس ہنر سے اپنی نہ جان چھوٹی
کھاتے رہے ہیں پتھر ہم آئینہ دکھا کے

دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

خامشی پر ہیں لوگ زیر عتاب
اور ہم نے تو بات بھی کی ہے

کہتے تھے کہ اب کوئی نہیں جاں سے گزرتا
لو جاں سے گزر کر انہیں جھٹلا تو گئے ہم

آیئے ذرا ایک بار آپ کو سنٹرل جیل حیدرآباد کے اندر کی سیر کرائیں۔ اس میں خوف کی کوئی بات نہیں۔ گو باہر بہت اونچی دیواریں ہیں جن پر برقی رو کی تاریں نصب ہیں اور ان دیواروں کے اندر اور باہر شب و روز مستعد چاق و چوبند حفاظتی دستے متعین ہیں۔ لوہے کے بلند و بالا آہنی دروازے کے اندر اور باہر باوردی چہرے نظر آئیں گے۔ ایسے چہرے آپ نے کسی مغربی فلم کے جنگی مناظر میں دیکھے ہوں گے۔ آپ ایسا محسوس کریں گے کہ شاید یہ چہرے ہماری تہذیب اور کلچر سے بھی آشنا نہیں مگر ایسی بات نہیں یہ اپنے ہی بھائی ہیں اگر یہ بولیں تو ہماری ہی زبان بول سکتے ہیں۔ کچھ چہرے آپ کو اس طرح گھوریں گے گویا آنکھوں سے ایکسرے مشین کا کام لے رہے ہیں مگر اندر ان تین بیرکوں میں جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں، آپ کو قہقہے سنائی

دیں گے۔ پاکستان کے چاروں صوبوں کی زبانوں میں گیت گائے جارہے ہیں۔ ادب پر مباحثے ہورہے ہیں۔ سیاست پر سیمنار ہورہے ہیں۔ کسی شہید کا دن منایا جارہا ہے یا پھر کسی بناوٹی خوشی پر دعوت کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ مہینے میں ایک مرتبہ مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ ہر تیسرا آدمی شاعری فرماتا ہے بلوچی زبان کے معروف شاعر گل خان نصیر اور حبیب جالب کے علاوہ باقی تمام حضرات ادب پر کراٹے یا فری اسٹائل کے داؤ مارتے ہیں مگر خاطر احباب کے لیے کم از کم سبحان اللہ کہنا پڑتا ہے اور عام طور پر زیادہ داد اسی کو دی جاتی ہے جس کا کوئی شعر سمجھ میں نہ آئے سوائے اردو شعراء کے باقی ہر شاعر کا اردو میں ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اردو ہی رابطہ کی زبان ہے۔ ہر شام خان عبدالولی خان کے احاطے میں والی بال کھیلا جاتا ہے۔ کچھ بیمار لوگ سردار عطاء اللہ مینگل کی قیادت میں ایک طرف کرسیاں بچھا کر محظوظ ہورہے ہیں۔ کبھی کبھی بال کسی بیمار کے سر لگتی ہے تو کسی کی عینک کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ اس احاطے میں اک گروہ میر غوث بخش بزنجو کے جلو میں شطرنج کھیل رہا ہے اور ان حضرات کے انہماک کا یہ عالم ہے کہ جب تک گھپ اندھیرا نہ ہوجائے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ دوسرے احاطے میں شیر محمد صاحب مری برآمدے کے سامنے اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودوں کے قریب میز ڈالے اپنی محفل سجائے بیٹھے ہیں۔ قہوے کا دور چل رہا ہے معراج محمد خان سے مباحثے ہورہے ہیں۔ سردار خیر بخش مری جج کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ نجم عزیز سیٹھی صاحب کا قہقہہ بلند ہوتا ہے۔ کچھ حضرات چڑیا گھر کے شیر کی طرح دیوار کے ساتھ تیزی سے آجارہے ہیں۔ ان کے ورزش کے انداز کو دیکھ کر ذرا سی بے بسی اور بے چارگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس احاطے کے دوسرے برآمدے کے سامنے کوئٹہ کے ڈاکٹر عنایت اللہ خان صاحب اپنی محفل جمائے بیٹھے ہیں اور کچھ نوجوان بیٹھے ان کی باتوں سے لطف اندوز ہورہے ہیں۔ کبھی کبھی کسی کونے سے پشتو یا بلوچی کا نغمہ بلند ہوتا ہے کچھ دیر بعد کچھ اور ساتھی مل جاتے ہیں اور یہ کورس تالیوں کی تھاپ میں اختتام پذیر ہوتا ہے۔ برآمدے کے آخری کونے میں باورچی خانے کے سامنے والے چبوترے پر ریٹائرڈ کرنل سلطان محمد، جناب پرویز

سلیم، عبدالحمید صاحب اور دیگر ساتھیوں کے ہمراہ چار پائیوں پر بیٹھے چائے کی پیالی پر شکاریات اور فوجی ملازمت کے زمانے کے دلچسپ قصے سنا رہے ہیں اور ہر گزرنے والے کو چائے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کی شربتی رنگ کی چائے جسے سبز چائے کہتے ہیں کی پیالی چھوٹی سے چھوٹی اور اس میں شکر زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ چائے اتنی ٹھنڈی ہوتی ہے کہ کمزور آدمی کے جسم میں کپکپی پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ مٹھاس کا یہ عالم کہ رات گئے تک کام و دھن اس کے ذریعے سے لذت یاب رہتے ہیں۔ چائے اس شفقت سے پیش کرتے ہیں کہ شوگر کا مریض نہیں، نہیں کرتا کرتا ہوالشافی کہہ کر چڑھا جاتا ہے۔ شیر محمد مری صاحب کی میز سے چند گز آگے برآمدے کے سامنے جالب صاحب اکیلے بیٹھے ایک درخت کو دیکھ رہے ہیں۔ جہاں ایک کوئل کا بسیرا ہے۔ وہ کوکو کرتی رہتی ہے۔ جالب صاحب کے خیال میں ''پیا پیا'' پکار رہی ہے اور وہ شاید ان کے گیتوں کا مواد مہیا کر رہی ہے مگر میں اس سے بیزار ہوں۔ میرا بس چلے تو پتھر پھینک کر اسے اڑادوں مگر جیل کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں اور پھر جالب صاحب کا مصرع مجھے بار بار یاد آتا ہے۔

دنیا ہے کتنی ظالم ہنستی ہے دل دکھا کے

کوئل جتنا چاہے تنگ کرلے مگر شعراء کو تو ضرور انسپائر کرتی ہے اور پھر ایک معصوم پرندے کو روڑا مارتے ہوئے سلطان باہو کا یہ مصرع بھی یاد آجاتا ہے۔

تاڑی مار اڑا نہ باہو اسیں آپے اڈن ہارے ہو

جالب صاحب جیل کے ابتدائی چند ماہ اداس رہے کیونکہ ان کے جواں سال بچے کی موت ان کے لیے ایک سانحہ تھی۔ اس مجموعہ میں کئی جگہ انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے کبھی کبھی محفل کو اپنے لطائف سے کشت زعفران بناتے مگر پھر بجھ جاتے ار یہی وجہ تھی کہ بعض احباب کے لیے معمہ بنے رہے ہیں۔ اپنے بچوں سے والہانہ محبت میں بھی وہ زمانے کو بدلنے کی سعی پیہم سے روگرداں نہیں ہوے ء۔ نظم میری بچی میں لکھتے ہیں۔

تیری آشا کی کلیاں کھلے گی
چاند کی تجھ کو گڑیا ملے گی

تیری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے
ختم ہوگا ستم کا اندھیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

جیل کے تمام عرصہ میں اپنے جواں مرگ بچے کے غم اور چھوٹی بچی کی جدائی کے احساس نے انہیں اپنی گرفت میں رکھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بعض اوقات کئی کئی دنوں تک وہ خاموش رہتے بالخصوص عید کے دن انہوں نے اپنے سیل کے اندر کی کنڈی لگائے رکھی اور شام سے پہلے باہر نہ آئے کبھی کبھی ان کی طبیعت میں چڑ چڑاپن پیدا ہو جاتا۔ جس کی بظاہر کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی۔ جالب بظاہر بھولے بھالے اور سیدھے سادھے نظر آتے ہیں مگر درحقیقت وہ آہوئے زخم خوردہ کی طرح اپنے گردوپیش پر گہری نظر رکھتے ہیں اور بات بات پر چونک اٹھتے ہیں۔ ان کا اعتماد حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں جس پر اعتماد کرتے ہیں اس سے بھی خوف زدہ رہتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اسی مجموعے میں لکھتے ہیں۔

ہم نے سلوکِ یاراں دیکھا جو دشمنوں سا
بھر آیا دل ہمارا روئے ہیں منہ چھپا کے
دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

اوپر میں نے جیل کے جس ماحول کا ذکر کیا ہے۔ اس کے پیچھے ہر قیدی کی ایک قدر مشترک ہے۔ ہر دل دکھا ہوا، ہر ایک کا گھر اجڑا ہوا، جس پر دہشت و بربریت اور موت کے گہرے سائے ہیں۔ یادرفتگان وگم شدگان سے دل بوجھل پسماندگان کی بے چارگی ودرماندگی کا تفکر ہر درودیوار پر مقدس مگر ارزاں خون کے چھینٹے اور پھر سامنے تختہ دار کوئی بھی انسان دوست یہ قہقہے سنے تو محسوس کرے گا کہ یہ قیدی منہ چڑا رہے ہیں، استبداری قوتوں کا، یہ اور بات ہے کہ یہاں کا شیوہ مردانگی ہی ہے کہ کوئی اپنے مصائب اور تکالیف کا ذکر نہ کرے۔ میں نے جیل کے آٹھ ماہ میں کسی قیدی سے اس کی زبان سے اس کی خانہ ویرانی کی داستان نہیں سنی کوئی اس کی غیر موجودگی

میں ذکر کرے تو اور بات ہے۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے جگر صاحب نے لکھا تھا کہ ؎

زخم پہ زخم کھا کر بھی اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی عشق ہے دل لگی نہیں

میں تو پہلے ہی بیمار تھا صحت بحال کیسے ہوتی آہستہ آہستہ ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

طبیعت بے حد بگڑی تو لیاقت میڈیکل کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں پندرہ روز ایڑیاں رگڑتے رہے اور بالآخر ڈاکٹروں کی رپورٹ پر ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ چند دن بعد جالب صاحب بھی ضمانت پر رہا کر دیے گئے۔ پانچ ماہ کی شدید علالت کے بعد ذرا طبیعت سنبھلی تو بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ جالب صاحب پھر کسی جیل میں ہیں اور ان پر کیا بیت رہی ہے۔ لیجئے میرے دروازے پر دستک ہوئی ہے۔ پولیس مجھے بغیر وارنٹ گرفتار کرنے آئی ہے۔ اجازت دیجئے۔ خدا حافظ۔۔۔ ہاں مگر چلتے چلتے قرۃ العین طاہرہ کا ایک شعر سنتے جایئے ؎

بجرم عشق توام می کشند دغو غایست
تو نیز بر سر عام آکہہ خوش تماشایست

سیّد قسور گردیزی

حوالہ جات، کتابیات، حواشی

1- گلہائے عقیدت، از صوفی عنایت اللہ خان (صفحہ نمبر 3)

2- گھر کی گواہی۔ از۔ سعید پرویز (صفحہ 23-24)

3- -----ایضاً---(صفحہ 79)

4- -----ایضاً--- (صفحہ 24)

5- روزنامہ جنگ، سنڈے میگزین 18 تا 24 نومبر 2001۔ انٹرویو اشفاق احمد

6- گھر کی گواہی۔ از۔ سعید پرویز (صفحہ 81)

7- جالب بیتی۔ راوی۔ حبیب جالب (صفحہ 256)

8- -----ایضاً--- (صفحہ 253 تا 257)

9- -----ایضاً---(صفحہ 35 تا 37)

10- -----ایضاً--- (صفحہ 212)

11- مجلہ 1994۔ گھر کی گواہی (صفحہ 25)

12- گھر کی گواہی (صفحہ 98)

13- کالم "مارچ" جالب کا مہینہ روزنامہ ایکسپریس 9 مارچ 2004 از سعید پرویز

14- گھر کی گواہی (صفحہ 36 تا 42)

15- میں طلوع ہو رہا ہوں۔ از سعید پرویز (صفحہ 192)

16- جالب بیتی (صفحہ 18)

17- گھر کی گواہی (صفحہ 59)

18- جالب بیتی (صفحہ 24)

19- جالب بیتی (صفحہ 26)

20- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (صفحہ 44)

21- عالمی اردو ادب (دہلی) مدیر۔ نند کشور وکرم۔ 1994۔ حبیب جالب۔ ''فن اور شخصیت'' (صفحہ 342)

22- میں طلوع ہو رہا ہوں (صفحہ 317)

23- جالب بیتی (صفحہ 248)

24- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (صفحہ 49)

25- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (صفحہ 51)

26- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (صفحہ 65)

27- روز نامہ امروز لاہور، 4 اگست 1964، اخباری خبر' میں طلوع ہو رہا ہوں' صفحہ 921

28- جالب بیتی (صفحہ 55)

29- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (صفحہ 71-70)

30- روز نامہ امروز لاہور، 2 مارچ 1967

31- روز نامہ امروز لاہور 30 مئی 1967

32- جالب بیتی (صفحہ 87)

33- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (صفحہ 78)

34- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (صفحہ 114)

35- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (صفحہ 93)

36- حبیب جالب۔ فن اور شخصیت (کتاب، ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1978

37- جالب بیتی (صفحہ 161)

38- سنڈے میگزین روز نامہ ایکسپریس 9 اپریل 2006

39- جالب بیتی (صفحہ 167)

40- مجلّہ 1994، گھر کی گواہی (صفحہ 64)

41- جالب بیتی (صفحہ 347)

42- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (صفحہ 347)

43- سیارہ ڈائجسٹ (اپریل 1988، صفحہ 20)

44- جالب بیتی (صفحہ 315-314)

45- روز نامہ قومی اخبار کراچی مورخہ 26 دسمبر 2000

46- حبیب جالب۔فن اور شخصیت۔طبع 1978 (صفحہ 9)

47- جالب بیتی (صفحہ 218)

48- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (صفحہ 246)

49- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (صفحہ 242)

50- حبیب جالب۔فن اور شخصیت (طبع 178۔صفحہ 12)

51- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (ایضاً صفحہ 15)

52- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (ایضاً صفحہ 17)

53- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (ایضاً صفحہ 21)

54- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (ایضاً صفحہ 33)

55- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (ایضاً صفحہ 37)

56- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (ایضاً صفحہ 41)

57- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (ایضاً صفحہ 45)

58- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (ایضاً صفحہ 48)

59- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (ایضاً صفحہ 49)

60- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ (ایضاً صفحہ 54)

61- حبیب جالب۔فن اور شخصیت (طبع 1978۔صفحہ 65)

62- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔(ایضاً صفحہ 73)

63- کوئی تو پرچم لیکر نکلے۔مجاہد بریلوی (صفحہ 37)

64- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔(ایضاً صفحہ 87)

65- کوئی تو پرچم لیکر نکلے۔مجاہد بریلوی (صفحہ 91)

66- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔(ایضاً صفحہ 113)

67- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔(ایضاً صفحہ 143)

68- حرفِ سردار۔عرضِ ناشر (کلیات طبع 1986)

69- شاعرِ شعلہ نواء (صفحہ 83)

70- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔(ایضاً صفحہ 115)

71- گھر کی گواہی (صفحہ 157)

72- شاعرِ شعلہ نواء (صفحہ 47)

73- ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔(ایضاً صفحہ 53)

74- ہم کہ ٹھہرے اجنبی (تحریر و مرتب، ڈاکٹر ایوب مرزا۔صفحہ 265)